ماھنامہ
ربوہ

مارچ ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر
سید مبشر احمد ایاز

خود زمانے نے مجھے بُلایا ہے

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں :-

"اے بندگانِ خدا آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب امساکِ باراں ہوتا ہے اور ایک مُدت تک مینہ نہیں برستا تو اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کُوئیں بھی خشک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح جسمانی طور پر آسمانی پانی بھی زمین کے پانیوں میں جوش پیدا کرتا ہے اُسی طرح رُوحانی طور پر جو آسمانی پانی ہے یعنی خدا کی وحی۔ وہی سفلی عقلوں کو تازگی بخشتا ہے۔ سو یہ زمانہ بھی اس روحانی پانی کا محتاج تھا۔ مَیں اپنے دعویٰ کی نسبت اِس قدر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہُوں کہ مَیں عین ضرورت کے وقت خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہُوں۔

نہ صرف یہ کہ مَیں اِس زمانہ کے لوگوں کو اپنی طرف بُلاتا ہُوں بلکہ خود زمانے نے مجھے بُلایا ہے۔"

(پیغامِ صُلح۔ رُوحانی خزائن جلد نمبر ۲۳ صفحہ ۴۸۷-۴۸۶)

احمدی نوجوانوں کے لئے

مارچ 1995ء
امان 1374ھش

جلد 42 شمارہ 5 قیمت 5 روپے سالانہ 50 روپے

ایڈیٹر
سیّد مبشر احمد ایاز

پبلشر: مبارک احمد خالد
پرنٹر: قاضی منیر احمد
مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ
مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد
دارالصدر جنوبی ربوہ

اس شمارے میں

مقالہ افتتاحیہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں تھا

یہ ایک مشہور شعر کا مصرعہ ہے۔ اصل شعر تو یوں ہے کہ :-

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

بس "ہے" کی جگہ "تھا" کی ترمیم کی گئی ہے، کیونکہ جس کی تلاش ہو تو جب وہ آجائے تو پھر تلاش کرتے رہنا ناشکرے پن اور جہالت کی علامت ہُوا کرتی ہے۔

بہرکیف اِس شعر میں دراصل اس زمانے کا پُورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے کہ یہ زمانہ کس قدر کُفر والحاد کا شکار ہو کر، توحید کو ترک کر کے ایک "صنم کدہ" کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اور اب ضرورت تھی کہ پھر کوئی خدا کا بندہ ابراہیمی لباس میں جلوہ گر ہو کر دینِ حق کو کفر و شرک اور رسومات و بدعات کے بُتوں سے پاک کرے۔ اس زمانے کی حالت کیا تھی اور کس طرح ایک مامور اور مُصلح کی شدّت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اس کا اندازہ ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے جو کسی تشریح کے محتاج نہیں۔

سٹاڈرڈ اٹھارھویں صدی عیسوی میں دُنیائے اسلام کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے :-

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوّف کے طفلانہ توہّمات نے خالص اسلامی توحید پر پردہ ڈال دیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام اُن سے بھاگتے تھے۔ اور تعویذ گنڈے میں پھنس کر فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور اُن بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے جن کی پرستش بارگاہ ایزدی میں شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی ..... قرآن مجید کی تعلیم نہ صرف پس پُشت ڈال دی گئی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی... یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ بداعمالیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی۔....."

(اقبال نامہ صـ۲۶۱ بحوالہ تاریخ احمدیت جلد اوّل صـ۵)

یورپ کا ایک مفکّر سیّاح مارس انڈس لکھتا ہے :-

"..... ضرورت اس بات کی ہو گی کہ عرب دُنیا عہدِ نبویؐ کی طرح ایک بار پھر حرکت میں

آجائے اور اسی طرح مستحکم بھی ہو جائے۔ عرب قوم نے جن اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اُس زمانہ میں دیا وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی ہونی چاہئیں آج عرب دُنیا سوئی ہوئی ہے **اسے کسی محمدؐ کی ضرورت ہے جو اسے نیا الہام دے کر حرکت میں لے آئے**"۔ (رسالہ نگار (بھارت) فروری ۱۹۵۱ء بحوالہ تاریخ احمدیت جلد اول ص۶)

یورپ کے ایک مشہور پروفیسر میکنزی اپنی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" میں لکھتے ہیں:۔

"کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کے کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے جسے یوں کہنا چاہیئے کہ یہ معمّا حل کرنے کے لئے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں...... **ہمیں معلّم بھی چاہیئے** اور پیغمبر بھی ..... **غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے**....."

(بحوالہ تاریخ احمدیت جلد اول ص۷/ اخبار کوہستان لاہور ۲ مارچ ۱۹۵۸ء ص۱)

سید مناظر احسن گیلانی اِس وقت کے اسلام اور اہل اسلام کی حالتِ زار کا نقشہ یُوں کھینچتے ہیں:۔

"اِس مُلک میں مسلمانوں کی دُنیا بھی لُٹ رہی تھی اور لُٹتی چلی جا رہی تھی اور دین بھی ان کا اچانک ایسے مہیب نرغے میں گھر گیا تھا جس کے نتائج کو دیکھ کر بقول سر سید آنکھوں میں اندھیرا چھاتا چلا جاتا تھا اور پاؤں تلے کی مٹی نکلی چلی جاتی تھی"۔ (سوانح قاسمی جلد اول ص۲۷۶)

پھر لکھتے ہیں:۔

"نانوتہ سے باہر ہندوستان کے عام مسلمان اِس "فاجعہ کُبریٰ" کے شکار ہو کر تڑپ رہے تھے جو سرزمین ہند کے اسلامیوں کے لیے گویا "کربلائی حوادث" کا اعادہ تھا۔ جس گھرانے کے پاک خون سے کربلا کی قربان گاہ سیراب ہوئی تھی اُسی گھرانے کے ایک فرزند ـــــ بالاکوٹ کے دامن کو لالہ زار بنا کر خود تو حیاتِ جاوید کے آشیانوں میں مسکن بنا چکے تھے لیکن مسلمانانِ ہند امید کے اس بھڑکتے ہوئے چراغ کے اچانک گل ہو جانے کے ساتھ ہی اپنی قومی زندگی کو موت کے تیرہ و تار گڑھے کے سامنے کھڑی ہوئی پا رہے تھے۔ اُن کی سیاسی جدوجہد اسی پہاڑی درّے میں اپنی آخری سانس بظاہر پُوری کر چکی تھی اور کچھ ہند ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے اس عہد تک تمام دُنیائے اسلام کی عام زبوں حالیوں کو دیکھ دیکھ کر صرف مسلمان ہی یاس و ہراس میں مبتلا ہو کر اپنے ڈراؤنے مستقبل سے سہم نہیں رہے تھے بلکہ کامل گم گشتگی یا "ضلال مبین" کا ایسا گھُپ اندھیرا عالم اسلام پر چھایا ہوا تھا کہ اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے"۔ (سوانح قاسمی جلد اول ص۱۱ مصنفہ سید مناظر احسن گیلانی)

کفر و ضلالت کے اس طوفان میں یاس و ناامیدی کے اس منجدھار سے نکال لینے کے لئے جس ناخدا کی انتظار تھی وہ وہی اُمت محمدیہ کا امام منتظر تھا جس کو احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں "امام مہدی" اور "مسیح موعود" کا نام دیا گیا تھا اور علامات و نشانات کے مطابق اور اولیاء و صلحاء کی پیشگوئیوں کے مطابق اس کا زمانہ بھی وہی زمانہ بنتا تھا یعنی چودھویں صدی ہجری۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور عالم مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :۔

"مسلمانوں پر عام طور پر یاس و نومیدی اور حالات و ماحول سے شکست خوردگی کا غلبہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے انجام اور مختلف دینی و عسکری تحریکوں کو دیکھ کر معتدل اور معمولی ذرائع اور طریقہ کار سے انقلاب حال اور اصلاح سے لوگ مایوس ہو چلے تھے اور عوام کی تعداد کسی مرد غیب کے ظہور اور ملہم اور مؤید من اللہ کی آمد کی منتظر تھی۔ کہیں کہیں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا تھا کہ تیرھویں صدی کے اختتام پر مسیح موعود کا ظہور ضروری ہے۔" ("قادیانیت" از مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صلا)

تیرھویں صدی کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز میں تو یہ انتظار عید کے چاند کے انتظار کی کیفیت اختیار کر چکا تھا۔ ہر کوئی اس یقین سے رات کو سوتا تھا کہ اب نئی صبح کا سورج امام مہدی کے ساتھ ہی طلوع ہوگا اور شام کو چاند اسی منوّر چہرے کو روشن کرتا ہوا نکلے گا۔

اور ایک اَور مشہور بزرگ اور صوفی شاعر حضرت سلطان باہوؒ اسی انتظار سے بے چین ہو کر آنے والے کو پکارتے ہوئے کہتے ہیں :۔

چڑھ چناں تے کر روشنائی تیرا ذکر کریندے تارے ھُو

کہ اے چاند! اب جلد آ اور اپنی روشنی سے اسلام کی تاریک رات کو ختم کر دے اور "تارے" یعنی اولیاء و صلحاء اور ربّانی علماء بھی تیرے منتظر ہیں اور تیرا ہی ذکر کر رہے ہیں۔

ایک اَور مشہور صوفی بزرگ حضرت صوفی احمد جان صاحب جو حضرت مسیح موعودؑ کے ہم عصر تھے انہوں نے تو اپنی روحانی نگاہ سے یہ جان بھی لیا تھا کہ آنے والا امام منتظر یہی شخص ہے اسی لئے انہوں نے یہ درخواست بھی کر دی کہ :۔

سب مریضوں کی ہے تمہیں پہ نگاہ
تم مسیحا بنو خدا کے لئے

اور براہین احمدیہ کی اشاعت کے بعد تو اگر آپ کے پاس کوئی مرید ہونے کو آتا تو حضرت صوفی احمد جان صاحب اسی آفتاب و ماہتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے :۔

"سورج نکل آیا ہے اب تاروں کی ضرورت نہیں جاؤ حضرت صاحب (حضرت مرزا صاحب) کی

بیعت کرو۔" (بحوالہ تاریخ احمدیت جلد اوّل صـ۲۱۵)

الغرض یہ وہ کیفیت تھی اور وہ زمانہ تھا کہ جو بزبانِ حال المدد المدد کی پکار سے ایک مسیحا کو پکار رہا تھا، ایک ابراہیم کی تلاش میں تھا۔ اسلام کے اُوپر چھائی ہوئی اِس تاریک اور ظلمانی رات کے "تارے" بھی "چاند" کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

زمانے کی اسی تلاش اور پکار کو جب خدائے ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ میں شرفِ باریابی ہوئی تو خدا نے حسبِ وعدہ اپنے عہد کا نشان ظاہر کیا اور اُسی موعود اور مصلح کو امام بنا کر بھیجا جس کا اُس نے وعدہ کیا تھا چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام زمانے کی اسی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اے بندگانِ خدا آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب اِمساکِ باراں ہوتا ہے اور ایک مُدّت تک مینہہ نہیں برستا تو اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئیں بھی خشک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح جسمانی طور پر آسمانی پانی بھی زمین کے پانیوں میں جوش پیدا کرتا ہے اسی طرح روحانی طور پر جو آسمانی پانی ہے (یعنی خدا کی وحی) وہ سفلی عقلوں کو تازگی بخشتا ہے۔ سو یہ زمانہ بھی اس روحانی پانی کا محتاج تھا۔ مَیں اپنے دعویٰ کی نسبت اس قدر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مَیں عین ضرورت کے وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جبکہ اس زمانہ میں بہتوں نے یہود کا رنگ پکڑا اور نہ صرف تقویٰ اور طہارت کو چھوڑا بلکہ اُن یہود کی طرح جو حضرت عیسیٰؑ کے وقت تھے سچائی کے دشمن ہو گئے۔ تب بالمقابل خدا نے میرا نام مسیح رکھ دیا۔ نہ صرف یہ کہ مَیں اِس زمانہ کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہوں بلکہ خود زمانے نے مجھے بلایا ہے۔"

(براہین احمدیہ حصہ پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صـ۴۲۸)

لیکن جونہی اُمت کا نجات دہندہ آیا تو اُس کی قوم نے اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تکذیب کے درپے ہو گئے۔

بانی جماعت احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تمام مخالفین کو اپنی صداقت کے بے شمار دلائل پیش کیے اور فرمایا کہ دیکھو مجھے "علیٰ منہاج النبوّۃ" پرکھو، یعنی ہر وہ دلیل جو پہلے کسی نبی کی صداقت کا معیار تھی اسی معیار پر مجھے پرکھو اگر مَیں اُس معیار پر پورا نہ اُتروں تو مجھے جھوٹا قرار دو۔

قرآن کریم نے ماموریں کی صداقت کے لیئے ایک زبردست معیار پیش کیا ہے، ایسی کسوٹی ہے جس پر تمام انبیاء کی صداقت کو پرکھا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ

("مؤمن" آیت ۲۹)

• یعنی اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ کا وبال اُسی پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو اس کی کی ہوئی بعض پیشگوئیاں تمہارے متعلق پوری ہو جائیں گی۔

اس جگہ اس آیت کی تشریح ہم ایک ایسے شخص کی پیش کرتے ہیں جو عالم دین کہلاتے ہیں اور جنہوں نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی مخالفت میں صفحوں کے صفحے سیاہ کیئے ہیں یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جو کہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"یعنی اگر ایسی صریح نشانیوں کے باوجود تم اُسے جھوٹا سمجھتے ہو تب بھی تمہارے لیئے مناسب یہی ہے کہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ دوسرا احتمال اور نہایت قوی احتمال یہ بھی ہے کہ وہ سچا ہو اور اُس پر ہاتھ ڈال کر تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔ اس لیئے اگر تم اُسے جھوٹا بھی سمجھتے ہو تو اُس سے تعرض نہ کرو۔ اللہ کا نام لیکر جھوٹ بول رہا ہو گا تو اللہ خود اُس سے نمٹ لے گا"

(تفہیم القرآن جلد ۴ صفحہ ۴۰۷)

حضرت مسیح موعودؑ نے بھی اِسی امر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مخالفین کو کہا تھا کہ ؎

کچھ نہ تھی حاجت تمہاری نَے تمہارے مکر کی
خود مجھے نابود کرتا وہ جہاں کا شہریار

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

"خدا تعالیٰ کے راست بازوں اور ماموروں کے مقابلہ میں ہر قسم کی کوششیں اُن کو کمزور کرنے کے لیئے کی جاتی ہیں لیکن خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے وہ ساری کوششیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر بعض شریف الطبع اور سعید لوگ بھی ہوتے ہیں جو کہہ دیتے ہیں اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ۔ صادقوں کا صدق خود اس کے لیئے زبردست ثبوت اور دلیل ہوتا ہے اور کاذب کا کذب ہی اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ پس ان لوگوں کو میری مخالفت سے پہلے کم از کم اتنا سوچ لینا چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں یہ ایک راہ راستباز کی شناخت کی رکھی ہے۔"

(الحکم جلد ۸ ص۱۱ مورخہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۰۴ء)

لیکن بڑے بڑے پیر اور گدّی نشین اور بڑے بڑے مفسّر قرآن و عالم دین متین کہلانے والے اِس سعادت اور قرآن فہمی سے محروم رہے اور باوجود خود اس معیار کو سچا سمجھنے کے ایسے دلوں پر قفل پڑے کہ حضرت مرزا صاحب کی صداقت کو پرکھنے کے لیئے خدا کا پیش کردہ اصول انہوں نے رد کر دیا اور اپنے تیار کردہ اصولوں پر آپ کی صداقت کو

پر کھنا چاہا۔
لیکن حیرت ہے کہ ایک شخص نے ہمت کر کے اس قرآنی معیارِ صداقت کو پیش کیا جو نہ تو مشہور عالم تھا، نہ پنڈت، نہ مفسر تھا اور نہ محدّث بلکہ ایک معمولی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وہ اپنے اخبار "وفادار" لاہور مؤرخہ ۴ر جولائی ۱۹۰۸ء میں لکھتا ہے:۔

"مرزا صاحب کے بعد اگر سلسلہ احمدیہ نابود ہو جائے گا تو سمجھو کہ مرزا جھوٹا اور اگر ترقی کرے گا اور اس کے بعد اس کی جماعت یا اس کا جانشین اس کے مشن میں ترقی دینے میں کامیاب ہوا تو سمجھ لینا کہ مرزا سچا اور وہ الہام باری سے مستفیض ہوا اور اگر اس کی جماعت یا جانشین مٹتے چلے گئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی مذہبی رخنہ اندازی کبھی بھی پسند نہیں"۔

(اخبار "وفادار" بحوالہ حیاتِ مہدیؑ دوران ص۳۱۵ مؤلفہ محمد اشرف ناصر صاحب)

بس آج حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو فوت ہوئے بھی قریباً ایک صدی گزر گئی ہے۔ ۲۳ر مارچ ۱۸۸۹ء میں ایک شخص کے ہاتھ پر ۴۰ آدمیوں نے بیعت کی تھی اور آج وہ ایک شخص ایک کروڑ بن چکا ہے۔ اسوقت قادیان کی گمنام بستی سے جو ایک آواز اُٹھی تھی آج سارے عالم پر محیط ہے اور سٹیلائیٹ کے ذریعہ گھر گھر وہ آواز سنی جاسکتی ہے ـــــ یہ اگر خدا کی تائید و نصرت کا ایک روشن نشان نہیں ہے تو اَور کیا ہے؟ ـــــ اب باوجود مخالفت کی آندھیوں اور طوفانوں کے جماعت کا نہ صرف قائم رہنا بلکہ بڑھتے ہی چلے جانا اور ترقی کی راہ پر مسلسل اور بڑی تیزی سے قدم مارنا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی صداقت کی ایک روشن دلیل ہے ـــــ لیکن اس روشنی کو دیکھنے کے لیئے آنکھیں چاہئیں اور سمجھنے کے لیئے دل۔!

آخر پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا یہ اقتباس بھی پیش ہے جو ایک دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اگر خدا نہ چاہتا تو مَیں نہ آتا۔ ... جس قدر مَیں پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں اُسی قدر خدا تعالیٰ مجھے کھینچ کر آگے لے آتا ہے۔ میرے پر ایسی رات کوئی کم گزرتی ہے جس میں مجھے یہ تسلی نہیں دی جاتی کہ مَیں تیرے ساتھ ہوں اور میری آسمانی فوجیں تیرے ساتھ ہیں۔ اگرچہ جو لوگ دل کے پاک ہیں مرنے کے بعد خدا کو دیکھیں گے لیکن مجھے اسی کے مُنہ کی قسم ہے کہ مَیں اب بھی اُس کو دیکھ رہا ہوں۔

دُنیا مجھ کو نہیں پہچانتی لیکن وہ مجھے جانتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ مَیں وہ درخت ہوں جس کو مالکِ حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔......

اے لوگو! تم یقیناً سمجھ لو کہ میرے ساتھ وہ ہاتھ ہے جو اخیر وقت تک مجھ سے وفا کرے گا۔ اگر تمہارے مرد اور تمہاری عورتیں اور تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اور تمہارے چھوٹے اور تمہارے بڑے سب مل کر میرے ہلاک کرنے کے لیئے دُعائیں کریں یہاں تک کہ سجدے کرتے کرتے ناک گل جائیں اور ہاتھ شل ہو جائیں تب بھی خدا ہرگز تمہاری دُعا نہیں سُنے گا اور نہیں رُکے گا جب تک وہ اپنے کام کو پُورا نہ کرلے۔ اور اگر انسانوں میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو تو خدا کے فرشتے میرے ساتھ ہوں گے ــــــ ......

کاذبوں کے اَور مُنہ ہوتے ہیں اور صادقوں کے اَور ..... خدا کے مامورین کے آنے کے لیئے بھی ایک موسم ہوتے ہیں اور پھر جاتے کے لیئے بھی ایک موسم۔ پس یقیناً سمجھو کہ مَیں نہ بے موسم آیا ہوں اور نہ بے موسم جاؤں گا۔ خدا سے مت لڑو! یہ تمہارا کام نہیں کہ مجھے تباہ کردو۔"

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ۔ روحانی خزائن جلد نمبر ۱۷ صفحہ ۴۹-۵۰)

پھر آپ فرماتے ہیں :۔

"اے قوم کے بزرگو! اور دانشمندو! ذرہ ٹھنڈے ہو کر واقعات پر غور کرو۔ کیا یہ واقعات کاذبوں سے ملتے ہیں یا سچوں سے۔ کبھی کسی نے سُنا کہ کاذب کے لیئے آسمان پر نشان ظاہر ہوئے کبھی کسی نے دیکھا کہ کاذب اپنے اعجوبوں میں صادق پر غالب آسکا۔ کیا کسی کو یاد ہے کہ کاذب اور مفتری کو افتراؤں کے دن سے پچیس ۲۵ برس تک مہلت دی گئی جیسا کہ اِس بندہ کو۔ کاذب یوں مَلا جاتا ہے جیسے کھٹمل، اور ایسا نابود کیا جاتا ہے جیسا کہ ایک بُلبلہ۔ اگر کاذبوں اور مفتریوں کو اتنی مدّتوں تک مہلت دی جاتی اور صادقوں کے نشان اُن کی تائید کے لیئے ظاہر کیئے جاتے تو دُنیا میں اندھیر پڑ جاتا اور کارخانہ الوہیت بگڑ جاتا۔ پس جب تم دیکھو کہ ایک مدّعی پر بہت شور اُٹھا اور اسکی مخالفت کی طرف دُنیا جُھک گئی اور بہت آندھیاں چلیں اور طوفان آئے پر اس پر کوئی زوال نہ آیا۔ تو فی الفور سنبھل جاؤ اور تقویٰ سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم خدا سے لڑنے والے ٹھہرو.....!"

(سراجِ مُنیر۔ رُوحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۴)

میں کبھی آدم کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں
نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار

امروز قوم من نشناسد مقام من

فتح نصیب جرنیل

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو غیر از جماعت اہلِ علم احباب کا خراجِ تحسین

● نوٹ:۔ اس مضمون میں بہت سارے حوالے ہم نے حذف کر دیئے ہیں اور بعض حوالوں میں کچھ الفاظ یا فقرات حذف کرنے پڑے ہیں کیونکہ حکومتِ پاکستان کے نافذ کردہ "امتناعِ قادیانیت آرڈیننس" کے بموجب کوئی بھی احمدی اپنے عقیدے کا اظہار نہیں کر سکتا تحریراً نہ قولاً نہ فعلاً۔ اس لئے حوالے پڑھتے وقت اگر کسی دقت کا سامنا ہو تو ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں ——— (ادارہ)

ایسے جرات مند لوگ ہر زمانہ میں ہوتے ہیں جو کسی دوسرے سے علمی اور نظریاتی لحاظ سے عقیدہ اور رائے کے اعتبار سے اختلاف رکھنے کے باوجود حسب شناخت اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور جب کہ یہ معترف قوم میں کسی لحاظ سے قائدانہ مقام پر ہو تو اس کا یہ اعتراف دراصل اس وقت کی کل قوم کا اعتراف بن جاتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں ایسے ہی بعض انصاف پسند اصحاب کی وہ آراء، جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ذات اور عظیم دینی خدمات کے حوالہ سے ہیں، افادہ عام کیلئے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو زندگی گزارتے دیکھا اور بنظر عمیق اس کا جائزہ لیا۔ نیز انہوں نے اس وقت جب کہ "دین حق" پر ہر طرف سے ہر قوم و مذہب علمی طور پر حملہ آور تھا اور اس کے بالمقابل جوابی کارروائی تو کجا، کوئی دفاع کا حق ادا کرنے والا نہ تھا۔ اس شدت حاجت کے وقت اور بالکل بروقت آپ کے ہاتھ سے فتح نصیب جرنیل کے طور پر دشمنانان دین کے حملہ کے اس پسپا کن جواب کو اور ان وسیع فاتحانہ علمی خدمات کو دیکھا تھا کہ جن کے نتیجہ میں دین حق کے سر پر "لیظھرہ علی الدین کلہ" کا تاج ظفر سجا۔ اور کجا پہلے یہ حالت ہو چکی تھی کہ دین حق مظلوم کربلا کی طرح تھا اور کجا پھر یہ قوت و طاقت پائی کہ وہ ایک حملہ آور زبردست شیر ببر کی طرح میدان کارزار میں نہایت شان کے ساتھ "ھل من مبارز" کی گرجدار آواز سے ہر مخالف کو مقابل پہ بلا رہا تھا مگر ہر چند کسی طالع آزما کو آزمائش کے لئے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جرات و انصاف سے حصہ پانے والے یہ شریف الطبع لوگ ہندوستان میں اپنی اپنی جگہ قیادت کے مقام پر فائز تھے۔ ان میں سے بعض نے آپ کی زندگی میں اور بعض نے آپ کی وفات پر یا وفات کے بعد جو

اپنے مشاہدات پر مبنی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

O مشہور مسلم لیڈر منشی ظفر علی خان صاحب کے والد اور اخبار "زمیندار" کے بانی و ایڈیٹر منشی سراج الدین صاحب نے اپنی اخبار میں اپنی شہادت یوں لکھی:

"ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں بھی نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے۔ کاروبار ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا۔...... آپ بناوٹ اور افتراء سے بری تھے۔...... گو ہمیں ذاتی طور پر مرزا صاحب کے دعاوی یا الہامات کے قائل معتقد ہونے کی عزت حاصل نہ ہوئی مگر ہم ان کو ایک پکا *** ، سمجھتے ہیں"۔

O ایڈیٹر اخبار "وکیل" امرتسر مولانا ابوالکلام آزاد، جو ہندوستان کی معروف شخصیت تھے، نے اپنے اخبار کے ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء کے پرچہ میں حضور کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا:

"کیریکٹر کے لحاظ سے مرزا صاحب کے دامن پر سیاہی کا چھوٹا سا دھبہ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ ایک پاکباز جینا جیا اور اس نے ایک متقی کی زندگی بسر کی"

O ایک ہندو اخبار "برمھ پرچارک" نے بے ساختہ لکھا:

"ہم یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ (یعنی مرزا صاحب۔ ناقل) کیا بلحاظ لیاقت اور کیا بلحاظ اخلاق و شرافت کے ایک بڑے پایہ کے انسان تھے"۔

O ایڈیٹر اخبار "وکیل" مولانا ابوالکلام آزاد کے بھائی ابوالنصر مولانا غلام یسین آہ کو قادیان جا کر حضرت مسیح موعود سے ملاقات کرنے کا شوق ہوا جس کے لئے ان کو آٹھ میل پا پیادہ بھی چلنا پڑا۔ قادیان میں ۱۹۰۵ء کے اپنے اس قیام کی یادیں اور تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے اور کیا دیکھا۔ میں نے قادیان دیکھا۔ مرزا صاحب سے ملاقات کی۔ مہمان رہا، مرزا صاحب کے اخلاق اور توجہ کا مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیئے...... اگر مرزا صاحب کی ملاقات کا اشتیاق میرے دل میں موجزن نہ ہوتا تو شاید آٹھ میل تو کیا آٹھ قدم بھی میں آگے نہ بڑھ سکتا۔...... مرزا صاحب کی صورت نہایت شاندار ہے جس کا اثر بہت قوی ہوتا ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک اور کیفیت ہے۔ اور باتوں میں ملائمت ہے۔ طبیعت منکسر مگر حکومت خیز۔ مزاج ٹھنڈا مگر دلوں کو گرما دینے والا۔ بردباری کی شان

نے انکساری کی کیفیت میں اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ گفتگو ہمیشہ اس نرمی سے کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا متبسم ہیں........ مرزا صاحب کی وسیع الاخلاقی کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ ہے کہ اثنائے قیام کی متواتر نوازشوں کے خاتمہ پر بایں الفاظ مجھے مشکور ہونے کا موقعہ دیا۔ "ہم آپ کو اس وعدہ پر اجازت دیتے ہیں کہ آپ پھر آئیں اور کم از کم دو ہفتہ قیام کریں" (اس وقت کا تبسم ناک چہرہ اب تک میری آنکھوں میں ہے) میں جس شوق کو لے کر گیا تھا ساتھ لایا اور شاید وہی شوق مجھے دوبارہ لے جائے۔ واقعی قادیان نے اس جملہ کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ "وحسن خلقک ولو مع الکفار"

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا جہاد یوں تو ہر باطل کے خلاف تھا مگر اصل ہدف بگڑی ہوئی عیسائیت تھی جسے اس وقت حکمران مذہب ہونے کا فائدہ بھی حاصل تھا۔ آپ نے علاوہ قرآن مجید اور تورات و انجیل کی اندرونی شہادتوں کے عقلی دلائل سے بھی مذہب تثلیث کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ آپ کے اس فاتحانہ کارنامہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے آل انڈیا کرسچین ایسوسی ایشن کے سیکرٹری مسٹر والٹر ایم اے کا بیان پڑھئے جو انہوں نے اپنی انگریزی کتاب "احمدیہ موومنٹ" میں درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ بات ہر طرح سے ثابت ہے کہ مرزا صاحب اپنی عادت میں سادہ اور فیاضانہ جذبات رکھنے والے تھے۔ ان کی اخلاقی جرات جو انہوں نے اپنے مخالفین کی طرف سے شدید مخالفت اور ایذاء رسانی کے مقابلہ میں دکھائی، یقیناً قابل تحسین ہے۔ صرف ایک مقناطیسی جذب اور دلکشی اخلاق رکھنے والا شخص ہی ایسے لوگوں کی دوستی اور وفاداری حاصل کر سکتا ہے۔ جن میں سے کم از کم دو نے افغانستان میں اپنے عقائد کے لئے جان دے دی مگر مرزا صاحب کا دامن نہ چھوڑا"۔

O مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر اخبار "وکیل" جن کی تحریر کا ایک حوالہ اوپر گذر چکا ہے، آپ کی وفات کے معاً بعد انہوں نے اپنی اخبار میں ایک خصوصی مقالہ بعنوان "موت عالم" لکھا۔ اس میں وہ آپ کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ شخص، بہت بڑا شخص، جس کا قلم سحر تھا اور زبان جادو۔ وہ شخص جو دماغی عجائبات کا مجسمہ تھا۔ جس کی نظر فتنہ اور آواز حشر تھی۔ جس کی انگلیوں سے انقلاب کے تار

الجھے ہوئے تھے۔ اور جس کی دو مٹھیاں بجلی کی دو بیٹریاں تھیں۔ وہ شخص جو مذہبی دنیا کے لئے تیس برس تک زلزلہ اور طوفان رہا۔ جو شور قیامت ہو کر خفتگان خواب ہستی کو بیدار کرتا رہا، خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ گیا۔ .... اور اس کے ساتھ مخالفین اسلام کے مقابلہ پر اسلام کی اس شاندار مدافعت کا، جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی، خاتمہ ہو گیا۔ ان کی یہ خصوصیت کہ وہ اسلام کے مخالفین کے برخلاف ایک فتح نصیب جرنیل کا فرض پورا کرتے رہے ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس احساس کا کھلم کھلا اعتراف کیا جائے تاکہ وہ مہتم بالشان تحریک جس نے ہمارے دشمنوں کو عرصہ تک پست و پائمال بنائے رکھا۔ آئندہ بھی جاری رہے"۔

O دین حق پر حملہ کرنے والوں کے خلاف آپ کا علم کلام کا وار ایسا کاری تھا اور اس میں ایسی قوت اور شوکت تھی کہ مخالفین کو دم مارنے کی مجال نہ رہی اور جو بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے وہ چھپنے کے لئے جگہ نہ پاتے تھے اور موافقین پر وجد طاری تھا۔ چنانچہ دہلی کے اخبار "کرزن گزٹ" کے ایڈیٹر میرزا حیرت دہلوی اپنے اخبار میں آپ کی ایسی ہی عظیم خدمات کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

"مرحوم کی وہ اعلیٰ خدمات جو اس نے آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کی کی ہیں وہ واقعی بہت ہی تعریف کی مستحق ہیں........ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے آریہ اور بڑے سے بڑے پادری کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ مرحوم کے مقابلہ میں زبان کھول سکتا........ اس کے قلم میں اس قدر قوت تھی کہ آج سارے پنجاب بلکہ بلندی ہند میں بھی اس قوت کا کوئی لکھنے والا نہیں........ اس کا پر زور لٹریچر اپنی شان میں بالکل نرالا ہے اور واقعی اس کی بعض عبارتیں پڑھنے سے ایک وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے"۔ (کرزن گزٹ دھلی یکم جون ۱۹۰۸ء)

O آپ کی دینی خدمات ایسی پُر شکوہ تھیں کہ کئی غیر مسلموں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ حتی کہ بڑے بڑے عیسائی بھی عظیم مذہبی انقلاب برپا کرنے والوں کی مشابہت بیان کرنے کیلئے اپنے پادریوں کا نام رد کر کے آپ کا نام لکھنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ انگریزی اخبار "پایونیر" الہ آباد کے انگریز عیسائی ایڈیٹر کی تحریر کا ترجمہ پیش ہے۔ لکھتے ہیں۔

"وہ لوگ جنہوں نے مذہب کے رنگ میں دنیا میں ایک حرکت پیدا کی ہے وہ اپنی طبیعت میں........ انگلستان کے لاٹ پادری کی نسبت مرزا غلام احمد صاحب سے زیادہ مشابہ ہوا کئے ہیں۔ اگر ارنسٹ زینن مشہور فرانسیسی مؤرخ گذشتہ بیس سال کے اندر (یعنی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے وقت میں۔ ناقل) ہندوستان میں ہوتا تو وہ یقیناً مرزا صاحب کے پاس جاتا اور ان کے حالات کا مطالعہ کرتا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انبیاء بنی اسرائیل کے عجیب و غریب حالات پر ایک نئی روشنی پڑتی"۔

O صدر جمعیت احرار چوہدری افضل حق صاحب اپنی کتاب "فتنہ ارتداد اور پولیٹیکل قلابازیاں" میں انیسویں صدی کے آخر پر غیر مسلموں کے اسلام پر حملوں اور اس کے بالمقابل مسلمانوں کے جمود کا ذکر کرنے کے بعد آپ کو یوں خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں:

"مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں تو کوئی جماعت تبلیغی اغراض کے لئے پیدا نہ ہو سکی۔ ہاں ایک دل مسلمانوں کی غفلت سے مضطرب ہو کر اٹھا۔ ایک مختصر سی جماعت اپنے گرد جمع کر کے اسلام کی نشر و اشاعت کیلئے بڑھا........ اپنی جماعت میں وہ اشاعتی تڑپ پیدا کر گیا جو نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کیلئے قابل تقلید ہے بلکہ دنیا کی تمام جماعتوں کے لئے نمونہ ہے"۔

O مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا:

"مرزا صاحب تو بہرحال اپنے تئیں...... خادم اسلام کہتے تھے اور مسیحیوں آریوں اور ملحدوں کے جواب میں اور تائید اسلام میں سینکڑوں ہزاروں صفحے لکھ گئے ہیں"۔

O مولانا ظفر علی خان صاحب لکھتے ہیں:

"ہندو اور عیسائی مذہبوں کا مقابلہ مرزا صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ کیا ہے"۔ (زمیندار ۱۲۔ ستمبر ۱۹۲۳)

O شمالی ہند کے مشہور مسلم صحافی مولانا سید حبیب مدیر "سیاست" اپنی کتاب "تحریک قادیان" میں تسلیم کرتے ہیں کہ:

"اس وقت کہ آریہ اور مسیحی مبلغ اسلام پر بے پناہ حملے کر رہے تھے۔........ مرزا غلام

احمد صاحب میدان میں اترے اور انہوں نے مسیحی پادریوں اور آریہ اپدیشکوں کے مقابلہ میں اسلام کی طرف سے سینہ سپر ہونے کا تہیہ کر لیا۔ مجھے یہ کہنے میں ذار باک نہیں کہ مرزا صاحب نے اس فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا اور مخالفین اسلام کے دانت کھٹے کر دیئے"۔ (تحریک قادیان صفحہ ۲۰۷ تا ۲۱۰)

O ایڈیٹر اخبار "صادق الاخبار" ریواڑی نے حضرت مسیح موعود کی وفات پر آپ کا ذکر خیر کرتے ہوئے یوں خراج تحسین ادا کیا:

"واقعی مرزا صاحب نے حق حمایت اسلام کماحقہ ادا کر کے خدمت دین اسلام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انصاف متقاضی ہے کہ ایسے اولوالعزم حامئی اسلام اور معین المسلمین، فاضل اجل، عالم بے بدل کی ناگہانی اور بے وقت موت پر افسوس کیا جائے"۔

O حضرت مسیح موعود کی خدمات کے علاوہ آپ کی ذات اور اوصاف کو بھی کئی جرات مند شرفاء نے سراہا جن میں مسلم و غیر مسلم سبھی شامل ہیں۔ کچھ کا تذکرہ ابتداء میں ہو چکا ہے۔ آخر پر ہر چند مزید حوالہ جات درج کئے جاتے ہیں۔

O معروف قلمکار مولانا نیاز احمد خان نیاز فتحپوری لکھتے ہیں:

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مرزا صاحب جھوٹے انسان نہیں تھے"۔

پھر لکھتے ہیں:

"وہ صحیح معنی میں عاشق رسول ﷺ تھے اور اسلام کا بڑا مخلصانہ درد اپنے دل میں رکھتے تھے"۔ ("نگار" ستمبر ۱۹۶۰ء)

O لاہور کے مشہور رسالہ "تہذیب النسواں" کے مالک پھر منیجر سید ممتاز علی صاحب نے جو بہت بڑے عالم و فاضل اور روشن خیال بزرگ تھے۔ حضور کی وفات پر اپنے خیالات اس طرح ظاہر فرمائے:

"مرزا صاحب مرحوم نہایت مقدس اور برگزیدہ بزرگ تھے اور نیکی کی ایسی قوت رکھتے تھے جو سخت سے سخت دل کو تسخیر کر لیتی تھی۔ وہ نہایت باخبر عالم، بلند ہمت مصلح اور پاک زندگی کا نمونہ تھے۔......... ان کی ہدایت اور راہ نمائی مردہ روحوں کیلئے واقعی مسیحائی

تھی"۔

O ہندوستان کے معروف اور نامور ادیب علامہ نیاز فتحپوری، جن کی رائے پہلے درج ہو چکی ہے، ایک اور موقعہ پر اپنے رسالہ "نگار" میں لکھا:

"......... تاہم اگر اس وقت تک کے تمام تاثرات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر مجبور کیا جائے تو میں بلا تکلف کہہ دوں گا کہ وہ بڑے غیر معمولی عزم و استقلال کا صاحب فراست و بصیرت انسان تھا۔ جو ایک خاص باطنی قوت اپنے ساتھ لایا تھا........ اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے یقیناً اخلاق اسلامی کو دوبارہ زندہ کیا اور ایک ایسی جماعت پیدا کر کے دکھادی جس کی زندگی کو ہم یقیناً اسوہ نبوی ﷺ کا پرتو کہہ سکتے ہیں"۔

O ہندوستان کے ایک اور جید اور مشہور عالم شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب حضور کی وفات کے چند سال بعد حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی سے ملے تو مولانا میر حسن صاحب نے چشم پُر آب ہو کر بڑے تاسف سے کہا:

"افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ ان کے کمالات روحانی کو بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی معمولی انسانوں کی زندگی نہ تھی بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندے ہوتے ہیں اور دنیا میں کبھی کبھی آتے ہیں۔"

امروز قوم من نشناسد مقام من ‌ ‌ روزے بگریہ یاد کند وقت خوشترم

آج میری قوم نے میرے مقام کو نہیں پہچانا لیکن ایک وقت آئے گا کہ میرے اس زمانے کو وہ یاد کر کے رویا کریں گے (کہ اے کاش ہم اس وقت اس کو مان لیتے)

O ایک ذی علم اور اپنے علاقہ کے معزز ہندو لالہ نرائن داس صاحب نے آپ کی وفات پر ایک احمدی دوست کو تعزیتی خط لکھا جس میں وہ آپ سے اپنی عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"ان کی وفات کا خیال کرنا ہماری غلطی ہے۔ کیونکہ وہ تو ہر وقت زندہ جاوید ہیں۔ جب تک دنیا قائم رہے گی ان کا نام چمکتا رہے گا۔ ان کی تصانیف سے باسمجھ آدمی عموماً اور دھرماتما آدمی (یعنی مذہبی شخص۔ ناقل) خصوصاً بہرہ یاب ہوتے رہیں گے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب ان کا ظاہری درشن ہمیشہ کے لئے پردہ کے اندر ہے جو کہ ایک بدچلن کے واسطے راہ راست پر لانے کے لئے کافی تھا"۔

یہ تمام تاثرات، خیالات اور بیانات تو محض اس غرض سے جمع کئے گئے ہیں کہ حق شناس اور حق گو لوگوں سے یہ زمین کبھی خالی نہیں رہی۔ ورنہ یہ حقیقت ازل سے اپنی جگہ ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے لوگ کبھی بھی دنیا کی تعریفوں کے محتاج نہیں رہے نہ انہیں اس سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ ان کی نظر تو اس یار ازل پر ہوتی ہے۔ جس کی خوشنودی ہی مدار فلاح و نجات ہے اور جس کی رضا ہی جنت خلد ہے۔ جو دلوں اور اندرونوں کو ان کی پاتال تک جانتا ہے اور جس کے آگے کسی کاذب یا فریب کار کی کچھ چل نہیں سکتی جو غضب میں تو یقیناً دھیما ہے مگر ہے آمرزگار۔ جس کی پشت پر اس کا ہاتھ نظر آئے اسے کوئی مٹا نہیں سکا اور جس پر اس کی مار پڑے اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ خدا ہمیں اپنے غضب سے ہمیشہ بچا کر رکھے اور اپنی خوشنودی اور رضامندی ہمارے لئے لکھ دے۔ آمین۔

(ترتیب و تحریر:۔ مکرم خواجہ ایاز احمد صاحب)
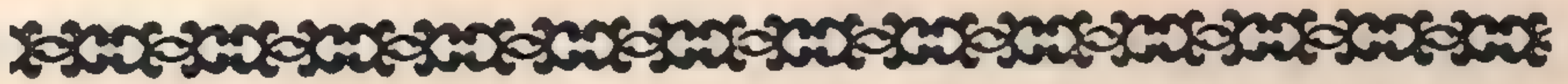
بقیہ از صفحہ 17

اے کانِ دلربائی دانم کہ از کجائی
تو نورِ آں خدائی کیں خلق آفریدہ

اے کانِ حسن میں جانتا ہوں کہ تو کس سے تعلق رکھتی ہے۔ تُو تو اس خدا کا نور ہے جس نے یہ مخلوقات پیدا کی۔

مَیلم نماند باکس، محبوبِ من تونی بس
زیرا کہ زاں فغاں رس نورت بما رسیدہ

مجھے کسی سے تعلق نہ رہا۔ اب تو ہی میرا محبوب ہے کیونکہ اس خدائے فریادرس کی طرف سے تیرا نور ہم کو پہنچا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم حاشیہ۔ صفحہ ۲۷۴۔ ۲۷۵) (روحانی خزائن جلد اول صفحہ ۳۰۴۔ ۳۰۵)

"درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے" (مہتمم وقار عمل)

کلام الامام ـــــ در مدحِ قرآن

(حضرت مسیح موعود...... کا پاکیزہ کلام)

از نورِ پاک قرآن صبحِ صفا دمیده
بر غنچه ہائے دلہا بادِ صبا وزیده

قرآن کے پاک نور سے روشن صبح بیدار ہو گئی اور دلوں کے غنچوں پر باد صبا چلنے لگی۔

ایں روشنی ولمعاں شمس الضحیٰ ندارد
و ایں دلبری و خوبی کس در قمر ندیده

ایسی روشنی اور چمک تو دوپہر کے سورج میں بھی نہیں اور ایسی کشش اور حسن تو کسی چاندنی میں بھی نہیں۔

یوسف بقعرِ چاہے محبوس ماند تنہا
ویں یوسفے که تن ہا، از چاه برکشیده

یوسف تو ایک کنویں کی تہہ میں اکیلا گرا تھا مگر اس یوسف نے بہت سے لوگوں کو کنویں میں سے نکالا۔

از مشرقِ معانی صد ہا دقایق آورد
قدِ ہلالِ نازک زاں نازکی خمیده

منبع حقایق سے یہ سینکڑوں حقایق اپنے ہمراہ لایا ہے۔ ہلال نازک کی کمر ان حقایق سے جھک گئی۔

کیفیتِ علومش دانی چه شان دارد
شہدیست آسمانی، از وحیِ حق چکیده

تجھے کیا پتہ کہ اس کے علوم کی حقیقت کس شان کی ہے؟ وہ آسمانی شہد ہے جو خدا کی وحی سے ٹپکا۔

بقیہ صفحہ 16 پر

خریداران و ایجنٹ صاحبان سے درخواست

خریداران ماہنامہ خالد ربوہ اور ماہنامہ تشحیذ الاذہان ربوہ سے درخواست ہے کہ وہ بذریعہ خط ہمیں اپنے مکمل پتہ جس کے ساتھ پوسٹ کوڈ نمبر بھی ہو بھجوا کر ممنون فرمائیں تاکہ اُن کے پتہ کی چٹ پر کوڈ نمبر لکھ دیا جائے اور محکمہ ڈاک کی طرف سے اُن کو رسائل ملنے پر کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔

نوٹ۔ براہ کرم اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں!

(مینجر ماہنامہ خالد و تشحیذ الاذہان ربوہ)
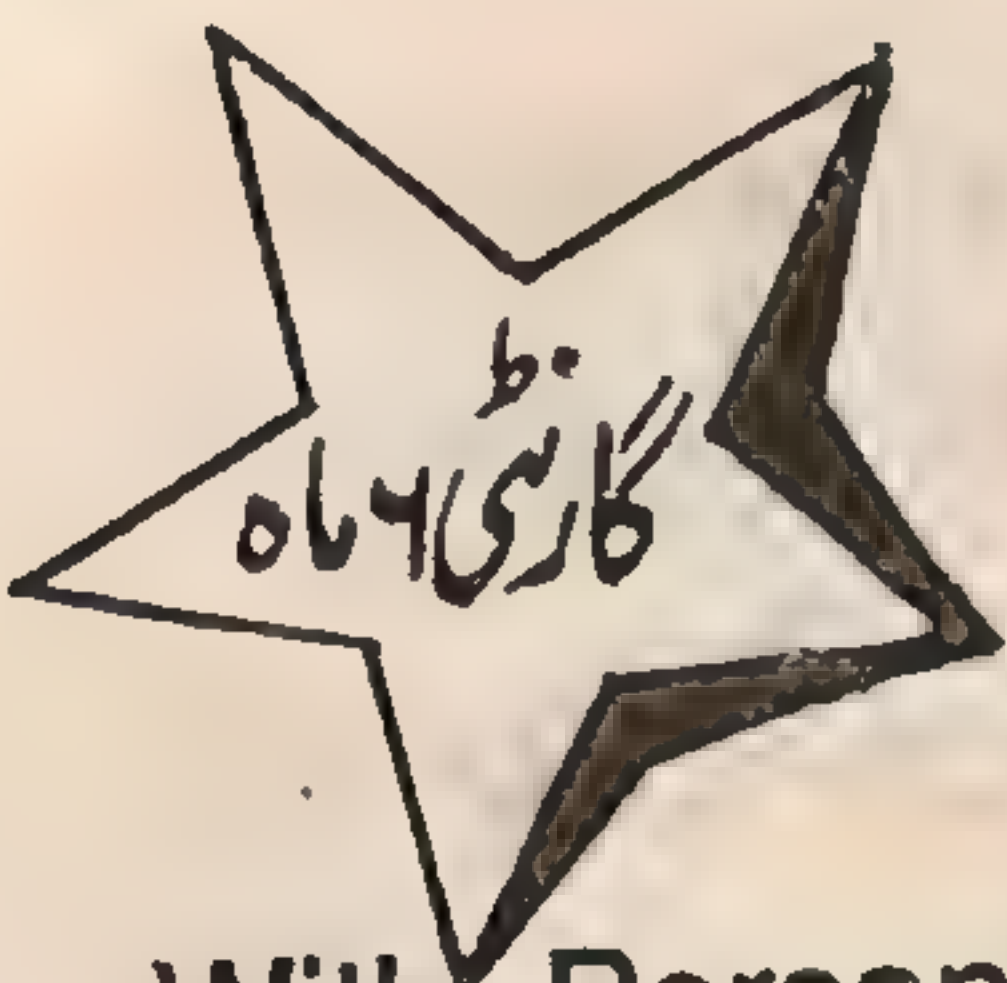
CHANNEL '3'
CHANNEL '5'
CHANNEL '7'

TECHNICS ELECTRONICS

ٹیکنکس الیکٹرانکس

22۔ گراؤنڈ فلور چوبرجی سینٹر نزد وینس سینما ملتان روڈ لاہور

Ph: 7419760.

مسیح موعودؑ کا اعجازِ مسیحائی

○ حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی رقم فرماتے ہیں :۔

ڈنگہ نامی ایک چھوٹا سا قصبہ ضلع گجرات (پنجاب) میں واقع ہے۔ اکثریت مسلمانوں کی ہے جو عموماً زراعت پیشہ مزدوری پیشہ اور مفلوک الحال غربت زدہ لوگ تھے کیونکہ اس زمانہ میں اراضیات زیادہ تر بارانی و بنجر تھیں۔ نہر کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دوسرے بڑے شہروں اور قصبات و دیہات کی طرح یہ مقام بھی پادر و مناد کی خاص توجہات کا مرکز بنا ہوا تھا اور لوگ چونکہ اس دور کی تہذیب و اخلاق اور تعلیم و مذاق سے بے بہرہ اور کورے تھے لہذا عیسائی مشن اور چرچ ان کو مہذب و بااخلاق بنانے، زیور تعلیم سے آراستہ کرکے بامذاق بنانے کی غرض سے وہاں پہنچا۔ مشن قائم ہوا۔ سکول جاری کیا۔ ہسپتال کھولا۔ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و وصیت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ہوتے ہوتے اس کا سکہ جم گیا۔ کام چل نکلا۔ نوجوان طبقہ پر ڈورے ڈالے جانے لگے۔ کوئی دقیقہ حصول مقصد کا اٹھا نہ رکھا گیا۔ سارے ذرائع اور تمام وسائل پوری عقلمندی سے استعمال کئے جاتے رہے اور اسی طرح اندر ہی اندر نئی پود پر گویا ان کا اب قبضہ و تصرف ہوگیا۔ نوجوانوں کو ایسی کچھ چاٹ لگی کہ خود بخود کھچے چلے آتے تھے، بے بلائے جمع رہتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ روکے نہ رکتے نہ ہٹائے ہٹتے۔ "جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے" ایک پارٹی بن گئی جس نے والدین اور رشتہ داروں کو چھوڑنا منظور کرلیا مگر پادری صاحبان کی کوٹھی گھر یا مکان و بیٹھک کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ کئی نے والدین کو کھلے نوٹس دے دیئے۔ کئی چپکے سے گھروں کو چھوڑ کر وہیں پہنچ گئے جہاں منادوں نے اشارہ کیا۔ بڑے بڑے معزز گھرانے بگڑنے لگے۔ کہیں لڑکوں کی خرابی کا رونا تھا تو کہیں لڑکیوں کے بگڑنے کا۔ غرض ایک طوفان تھا جس کی زد میں کئی شریف گھرانوں کی عزت و ناموس کے تابوت بہتے اور ڈوبتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ مغل، پٹھان، شیخ کا استثناء تھا نہ امیر و غریب کا۔ کئی گھرانے میرے علم میں ہیں اور کئی نام میرے سامنے ہیں مگر میں اس وقت صرف ایک ہی کا ذکر کرتا ہوں۔

اسی محلہ میں بلکہ اسی کوچہ میں سردار صاحب کے زیر سایہ ایک شخص عبداللہ نام قوم کے مراثی اور پیشہ کے پٹواری کا بیٹا محمد دین نام بھی اسی مرض میں مبتلا اور اسی صیاد کا صید ہو کر عیسائیت کے گڑھ گوجرانوالہ پہنچایا جاچکا تھا۔ محمد دین میں قوت دافع کی بجائے قبولیت کی استعداد اور جذب کا مادہ غالب تھا۔ اس نے عیسائیت کا اثر قبول کیا اور ایسا گہرا رنگ پکڑا کہ جس کا اترنا کچھ آسان نہ تھا۔ والدین اور بھائی بہنوں سے جدا ہو کر وہ ایسا غائب ہوا کہ کچھ عرصہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ گیا کہاں اور ہے کدھر۔ مدت بعد جب اس کی خبر ملی تو اس کی حقیقی ماں جو اس کے فراق میں بے قرار اس کی جدائی سے بے چین رات دن رونے دھونے میں بسر کیا کرتی تھی مامتا سے مجبور غیرت کے مارے مسلمانی کے نام اور ناموس کے بچانے کی نیت سے کمر ہمت باندھ نیت سادھ کر کھڑی ہوئی۔ خاوند سے بصد منت اجازت لے کر گوجرانوالہ پہنچی جہاں اس کا لخت جگر اور نور نظر نہ معلوم کتنے پردوں اور سخت اوٹوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کی ہمت اس کا اصرار اس کا استقلال حصول مقصد میں اس کا معاون بنا۔ اس کے دل میں مامتا اور مامتا کے ساتھ ایک درد تھا۔ تڑپ تھی اور سچی خواہش زبان صاف تھی اور مافی الضمیر کے بیان پر قادر جس سے سنگدل صیاد بھی موم ہوگئے اور اس طرح وہ مدت سے بچھڑے ہوئے بیٹے کو ملنے میں کامیاب ہوگئی۔

درد، ہجر و فراق سے چور فلاکت زدہ اور محزون۔ ایک حقیقی ماں اور بیٹے کی ملاقات کا منظر ہر آنکھ دیکھ اور ہر دل محسوس کر سکتا ہے جس نے آغوش مادر کی لذت چکھی اور اس کی محبت و لطف سے حصہ پایا ہو۔ ان تفاصیل کو چھوڑتا اور قصہ مختصر کرتا ہوں۔ ماں نے دل کھول کر بھڑاس نکالی گویا کلیجہ نکال کر بیٹے کے سامنے رکھ دیا اور انتہائی کوشش کی۔ سارا زور لگایا کوئی طریق نہ چھوڑا بیٹے کو سمجھانے اور اس کا دل نرم کرنے کا مگر بے سود۔ یہ وہ نشہ ہی نہ تھا جسے ترشی اتار دے۔ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد"۔ ناچار دل کو تھامے یوں تسلی دیتی ہوئی بولی اچھا زندہ رہو۔ پھر ملوں گی۔ ملنے کی راہ تو کھل گئی۔

یہ ملاقات ہوئی اور گو بے نتیجہ نکل گئی مگر وہ مردانہ ہمت مایوس ہوئی نہ تھکی بلکہ اس کے دل میں امید کی ایک جھلک اور کامیابی کی ایک شعاع پیدا ہوگئی اور وہ بجائے اداس و ناشاد واپس جانے کے ایک خوشی اور امید بھرا دل لے کر واپس ہوئی۔ گھر پہنچی۔ حال احوال لیا دیا۔ مگر گھر اسے کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کی دلچسپی کی ایک ہی چیز تھی مگر گھر اس سے بھی محروم ہوچکا تھا۔ ناچار کچھ عرصہ بعد تھوڑا وقفہ دے کر وہ پھر وہیں پہنچی جہاں اس کی آنکھ کا تارا اور دل کا سہارا فرنگ میں اسیر و محبوس

ایک آزاد زندگی بسر کر رہا تھا۔ گو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات اور امید وہی موہوم تھی۔ محمد دین اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرکا بلکہ اور زیادہ سخت اور سیاہ دل ہو کر ہدایت سے دور اور کفر سے بھرپور ہو چکا تھا۔ اس کے حیاء کی چادر پھٹ کر پارہ پارہ اور زبان کی قینچی اور زیادہ تیز ہو گئی تھی اور اس طرح اس کی ماں اگرچہ اب کے بھی بظاہر ناکام اور بے نیل و مراد واپس ہوئی تھی مگر اس کے دل میں ایک چیز تھی جس کی وجہ سے وہ پرامید تھی۔ (محمد دین کی والدہ)

پھیلاں (فضل بی بی۔ فضل بیگم یا فضل النساء) خود ایک سیدھی سادی مسلمان نماز روزہ کی پابند عورت تھی۔ ملکی رواج کے مطابق کچی پکی اور میٹھی روٹی کتابیں اس نے سنی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی قادیان کا نام اور سیدنا حضرت مسیح موعود.... کا پیغام بھی شیخ مولا بخش صاحب کے ذریعہ سے اس کے کان میں پہنچ چکا تھا۔ شیخ احمد دین صاحب کے قادیان پہنچ کر دجالی فتنہ کے محفوظ ہونے کا چرچا بھی وہ سن چکی تھی۔ نیز دوڑ دھوپ اور کوشش کے علاوہ دعا کا نسخہ بھی اس کو مل چکا تھا۔ خدا اس کے رسول ﷺ اور اپنے دین یعنی اسلام کے لئے اس کے دل میں ایک غیرت اور حمیت موجود تھی۔ وہ اپنی نمازوں میں رو رو کر دعائیں کرتی اور خدا سے مدد مانگنے میں مصروف رہنے لگی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ خدا نے اس کی سن لی۔ اس کی آہ و زاری اور اضطرار پر رحم کیا اور ایسے سامان پیدا کر دیئے جن سے پھیلاں کے مقصد کے حصول کی راہیں کھل گئیں۔ اس کے دل کی آگ نے بخار بن کر محمد دین پر حملہ کیا۔ اس کی قلبی جلن اور سوزش پہلے تپ محرقہ بن کر اسے جلاتی رہی اور آخر دق کی صورت میں اس پر مسلط ہو گئی۔ علاج معالجے اور ڈاکٹری تدابیر بے کار رہیں اور جب حالت نازک سے نازک تر ہو گئی تو مجبور ہو کر محمد دین کی ماں کو اطلاع دی گئی۔ وہ پہنچی اور لڑکے کو نیم جان پایا۔ منت خوشامد کر کے اپنے لڑکے کو گھر لے جانے کی اجازت حاصل کی جس کے لئے مشن پہلے ہی تیار اور کسی بہانہ کی انتظار میں تھا۔ عورت کے سر احسان رکھا اور محمد دین کی گویا لاش ہی اس کے حوالے کی۔ جس کو لے کر وہ گھر پہنچی۔ علاج معالجہ اور مقدور بھر خدمت کی جسے وہ کچھ سنبھلا اور مرض میں بھی افاقہ ہوا۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اس کی ماں نے شیخ مولا بخش صاحب کے پاس اس کے نشست و برخاست کا انتظام کیا۔ جہاں سلسلہ بحث و مباحثہ اور سوال و جواب ہوا کرتے۔ مرض اس کے دونوں سخت تھے۔ جسمانی بھی اور روحانی بھی۔ جسمانی مرض کا وقفہ عارضی اور وقتی تھا تو روحانی بیماری بھی اس درجہ تک ترقی کر چکی تھی کہ شیخ صاحب کے بس کی نہیں تھی۔

حالات کا مطالعہ کر کے شیخ صاحب نے پھیلاں کو یہی مشورہ دیا کہ جس طرح ہو سکے لڑکے کو لے کر قادیان پہنچے جہاں روحانی اور جسمانی دونوں امراض کے مکمل علاج کے اللہ کریم نے سامان مہیا فرما رکھے ہیں۔

عورت کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ ذات برادری گلی محلے بلکہ شہر بھر میں وہ منہ چھپائے پھرتی اور ذلت بدنامی اور رسوائی کے خیال سے گھر سے نکلتی ہی کم تھی۔ شیخ صاحب کا مشورہ اس کے دل لگا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے سفر کی تیاری کر کے بیٹے کو علاج کی غرض سے اس سفر کے لئے رضامند کر لیا۔ گاڑی میں بیٹھ بیٹے سمیت دوسرے دن ہی بٹالہ اور وہاں سے بذریعہ یکہ قادیان پہنچ گئے۔ لڑکے کو مہمان خانہ یا مطب میں ٹھہرا کر خود حضرت اقدس کے دولت سرائے میں گئی اور ساری کہانی اپنی زبانی حضرت کے حضور بالتفصیل عرض کر کے چین لیا۔

پھیلاں میاں محمد دین کی والدہ کی ہمت میں مردانگی اور جو اس میں فرزانگی تھی بات کرنے کا طریق مافی الضمیر کے ادا کرنے کی توفیق اس کے رفیق تھے۔ اس طریق اور ایسے رنگ میں اس نے اپنی مصیبت اور درد دل کا اظہار کیا کہ حضرت کو اس کے حال پر رحم آگیا۔ حضرت نے اس کی دلجوئی فرمائی۔ سہارا اور تسلی دی جس سے اس کو ڈھارس بندھ گئی اور مقصود اسے نزدیک نظر آنے لگا اور اب وہ دھرنا مار دھونی رما کر ہی حضرت صاحب کے در پر بیٹھ گئی۔

حضرت نے ان کے قیام و طعام کا انتظام فرمایا۔ جسمانی علاج کے لئے حضرت نورالدین اعظم کو تاکید فرمادی اور روحانی مرض کے استیصال کی طرف حضرت صاحب نے خود توجہ دینی شروع فرمائی۔ اکثر ظہر کی نماز کے بعد اور پھر شام کی نماز کے بعد دربار لگتا۔ میاں محمد دین کو بلوا لیا جاتا اور ان کو اپنے اعتراض و شبہات پیش کرنے کا موقعہ دیا جاتا جن کے جوابات سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود...... خود دیا کرتے اور میاں محمد دین کو نہایت محبت اور نرمی اور توجہ سے حضرت سمجھایا کرتے اور ان کے ایک ایک شبہ و اعتراض کا حل فرمایا کرتے۔ اس سلسلہ نے طول پکڑا اور غالباً کئی ماہ تک ناغے اور وقفوں کے ساتھ سلسلہ جاری رہا۔ مگر چند ہی روز میں یہ بات کھل گئی کہ محمد دین کی نیت بخیر نہیں اور کہ اس میں طلب حق اور تحقیق کی خواہش بھی موجود نہیں۔ وہ کسی مجبوری کے ماتحت محض دفع الوقتی کرتا اور کسی موقعہ کی تاک میں رہتا ہے۔ ایک بات کے متعلق وہ خود اقرار کرتا ہے کہ حل ہو گئی مگر دوسرے وقت اسی پر اڑ بیٹھتا۔ صبح کو تسلیم کرتا، مان لیتا اور شام کو انکار اور انکار پر اصرار کرنے لگتا۔ بعض اوقات انتہا ضد ہٹ اور کج بحثی پر

اترتا کہ صاف معلوم ہوتا کہ شرارت اور خباثت کا مظاہرہ کر رہا ہے مگر حضرت مصلحت اور حکمت سے نظر انداز کر کے چشم پوشی فرماتے اور ٹال کر گفتگو روک دیا کرتے۔ اس کے دل کا زنگ اور کفر و انکار کی سیاہی اتنی سخت گہری اور میلی ہو چکی تھی جس کے دور کرنے کے لئے لمبے مجاہدہ، غیر معمولی محنت اور بھاری توجہ کی ضرورت تھی۔ اس کے دل کی زمین اتنی خشک اور ایسی سنگلاخ ہو چکی تھی کہ کوئی دلیل کارگر ہوتی تھی نہ برہان۔ اس کی فطرت کج اور سینہ سیاہ تھا۔ جس پر کوئی دوسرا رنگ چڑھ جانے کی گنجائش ہی باقی نظر نہ آتی تھی۔ وہ کنویں کی ایک کوری ٹنڈ بن چکا تھا جو کبھی ادھر لڑھک جاتی کبھی ادھر اور اس طرح اس کے تلون کے باعث اس کا کوئی اعتبار ہی نہ رہا تھا۔

روحانی مرض کی طرح اس کے جسمانی مرض کا بھی یہی حال تھا۔ اس میں بھی اتار چڑھاؤ کا غیر متناہی سلسلہ اور مدوجزر رہا کرتا تھا۔ کبھی تو حالت اس کی سنبھل جاتی اور وہ بھلا چنگا نظر آنے لگتا اور کبھی وہی پہلی حالت عود کر آیا کرتی اور وہ بالکل مردہ بن کر رہ جاتا اور گھڑی پل کا مہمان نظر آنے لگتا۔ اس کی ماں نہایت ہوشیاری سے اس کی نگرانی رکھتی اور حالات کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ اس کے تلون، کج بحثی اور ضد اور شرارت کے حالات سے متاثر ہو کر وہ گھبرا جایا کرتی۔ اس کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہو جاتا کہ مبادا حضرت ناراض ہو کر تنگ آکر اس کی بدنیتی معلوم کر کے ہمیں دھتکار ہی نہ دیں۔ جواب ہی نہ دے دیں اور اکثر چلایا کرتی اور رو دھو کر جہاں بیٹے کو سمجھایا کرتی وہاں وہ حضرت کے حضور بھی بصد منت و الحاح درخواستیں کرتی۔ التجائیں کرتی کہ حضرت خدا کے واسطے رحم کر کے چشم پوشی فرمائیں۔ درگزر کریں اور اس کا ہاتھ نہ چھوڑیں۔ ایک مرتبہ کلمہ پڑھا دیں پھر چاہے مر جائے مجھے اس کا غم نہیں۔ فکر ہے تو یہی کہ کافر نہ مرے۔

بات دراصل یہ تھی کہ والدہ اس کی اسے علاج کرانے کے وعدہ سے لائی تھی اور وہ بھی اسی خیال سے رضامند ہو کر چلا آیا تھا کہ حضرت مولانا نورالدین اعظم کا نام نامی اور اسم گرامی طبی دنیا کے بلند ترین منار اور شہرت کے عالی مقام پر نمایاں طور سے کندہ ہو چکا تھا ورنہ اگر اسے یہ وہم بھی ہوتا کہ اس کی ماں اس کی روحانی بیماری کے علاج کو مقدم سمجھ کر قادیان لا رہی ہے تو یقیناً وہ موت کو اس پر ترجیح دیتا اور اپنے گھر یا گوجرانوالہ سے باہر ایک قدم بھی نہ اٹھاتا کیونکہ حقیقت یہی تھی کہ اس کفر و شرک کا زہر اس کے جسم کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا اس کے خیالات پر قبضہ و تصرف پا چکا تھا اور کفارہ مسیح کا خون کچھ ایسا اس کے گوشت پوست میں رچ کر

جزو بدن ہو گیا تھا کہ ان چیزوں کا اس کے جسم و جان سے نکالنا یا خیالات سے دور کرنا قریباً ناممکن ہی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے یہ علم ہو گیا کہ اس کی جسمانی بیماری کے علاج کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی امراض کی بیخ کنی کے بھی سامان ہیں اور دلائل اور براہین ایسے قوی کفر شکن اور لاجواب ہیں جن کے جواب کی اس میں تاب ہے نہ برداشت تو اس نے ان سے بچنے کی کوشش کی۔ کبھی اس نے بیماری کا عذر کر کے مجلس میں آنے سے گریز کیا تو کبھی ضدو کج بحثی اور بدزبانی کر کے بات سننے سے پرہیز کیا۔ پہلو بدلتا رہتا۔ موقع ٹال دیا کرتا اور یہاں تک بھی شرارت کرتا کہ بدزبانی، گستاخی اور بے ادبی پر اتر آتا کہ شاید یہی راہ اس کی نجات اور قادیان سے بچاؤ کی ہو جائے۔ حضرت ناراض ہو کر نکال دیں یا کوئی طیش میں آکر مار بیٹھے تو غرض پوری اور مدعا حاصل ہو جائے۔

دوسری طرف اس نے خفیہ خفیہ بٹالہ کے عیسائیوں سے جوڑ توڑ اور ساز باز کرنا شروع کر دیا۔ ان کی امداد کی امید پر اور زیادہ دلیر، بے باک اور نڈر ہو کر گستاخی اور شرارت میں بڑھنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو تین مرتبہ قادیان سے بھاگ کھڑا ہوا تا بٹالہ پہنچ کر قلعہ بند اور محفوظ ہو جائے۔ مگر اپنی مردانہ ہمت ماں کی ہوشیاری، چستی اور بہادری کی وجہ سے ہر مرتبہ اپنے مقصد میں ناکام اور حیلوں میں نامراد رہا اور کبھی بھی قادیان سے باہر نہ نکل سکا۔

مصلحت الٰہی سے روحانی اور جسمانی دونوں طبیب کامل تھے۔ اس کی لمبی بیماری سے گھبرائے نہ تھکے۔ اس کی بے اعتدالیوں اور بدپرہیزیوں سے اکتائے نہ مایوس ہوئے بلکہ پورے استقلال تحمل اور ضبط سے اس کے علاج میں لگے رہے۔ گالی گلوچ کی پرواہ کی نہ شرارت و گستاخی کی پورے صبر و چشم پوشی اور درگزر سے کام لے کر اس کے گند دھوتے، ناسور صاف کرتے اور محبت سے مرہم پٹی کرتے رہے۔ نہ کسی طمع کی امید سے نہ کسی خدمت و سلوک کے خیال اور اجر و جزا کی رجا پر محض خالصاً للہ محض اس کی بھلائی کی نیت اور اس خیال سے کہ شاید چنگا ہو کر خدا کے غضب کی آگ سے نجات پا جائے۔ کفر و شرک کی مار اور نبیوں کی توہین سے بچ سکے۔

پھیلاں سیدنا حضرت مسیح موعود... کے حسن و احسان اور عطا...... اور اخلاق کریمانہ کو دیکھتی اور اپنے لڑکے کی کرتوتوں کے خیال سے مری جارہی تھی۔ ندامت اور شرم سے اس کا سر جھکا رہتا اور ہر وقت حضرت کی رحمت و شفقت کے گیت گاتی۔ دعائیں دیتی رہتی تھی۔ اس کی بے قراری و اضطرار دیکھا نہ جاتا تھا۔ جس دلی تڑپ اور منت سماجت سے وہ عورتوں اور مردوں اپنے اور بیگانوں سے

دعاؤں کے لئے التجا کیا کرتی تھی اس کا نقش آج تک دماغ میں قائم اور دل میں موجود ہے۔ اس کی تمنا اس کی آرزو اور یہی اس کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ اس کا بیٹا توبہ کرے اور سچے دل سے ایک بار کلمہ پڑھ لے۔ پھر چاہے دوسرے ہی دن مر جائے۔

مرے تو مسلمان ہو کر، کافر نہ مرے۔

محمد دین پڑھا لکھا میٹرک پاس نوجوان تھا۔ قادیان میں رہتے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ حضرت نورالدین اعظم کے مطب میں اس کی رہائش اور نشست و برخاست تھی۔ جہاں ہر رنگ ہر مذاق اور ہر مذہب و ملت کے لوگ آیا کرتے۔ امیر غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا نہ مسلم غیر مسلم کا۔ ہر قسم کا کھلا درویشانہ دربار تھا۔ جو سبھی کے واسطے یکساں و برابر کھلا رہتا تھا۔ کوئی..... جاتا کسی کو روک تھی نہ ٹوک۔ محمد دین کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ کوئی پابندی یا نگرانی جماعت کی طرف سے اس پر ہرگز نہ تھی۔ البتہ اس کی ماں اس کے حالات و عادات کی واقف اور رازدار ہونے کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی عقلمندی و ہوشیاری سے ضرور کرتی تھی۔ باقی بول چال گفتگو اور بات چیت کی اسے کسی سے بھی روک نہ تھی۔ لمبے عرصے تک رہنے کی وجہ سے نہ صرف مقامی لوگ اس سے واقف اور وہ ان سے آشنا ہو چکا تھا بلکہ مضافات قادیان اور گورداسپور بٹالہ وغیرہ کے لوگوں سے بھی اس کے تعلقات ہو چکے تھے۔ صحت جسمانی اس کی بہتر ہو رہی تھی بلکہ مطب میں رہ کر وہ طب کا مشتاق اور نسخہ جات کی تلاش..... میں رہنے لگا تھا اور اس طرح وہ خود نیم حکیم تو ضرور بن گیا تھا۔

ایک روز جون کے مہینہ میں کڑکتی دھوپ اور شدت دوپہر کے وقت جب کہ ہم دو تین آدمی موٹر گیراج والے دالان میں جہاں اس زمان میں حضرت کا پریس ضیاء الاسلام نام ہوا کرتا تھا دوپہر کی تلخی اور دھوپ کی حدّت کاٹ رہے تھے اچانک خلاف معمول غیر متوقع طور پر پھیلاں نہایت پریشان اور گھبراہٹ و اضطرار کی حالت میں آئی۔ اس کا اضطراب و درد کچھ ایسا تھا کہ ہمارے دل رحم سے بھر گئے اور ہم اس کی طرف ہمہ تن گوش بن کر متوجہ ہوئے۔ وہ روتی جاتی تھی اور بات کے ساتھ ساتھ جلد جلد اپنے دامن کو سنبھالتی جا رہی تھی۔ ایک کونہ کو پکڑتی اور چھوڑ دیتی پھر دوسرا پکڑ کر ٹٹولتی اور چھوڑ دیتی تھی کہ تیسرے یا چوتھے کونہ کو ٹٹول کر اس نے گرہ کھولنی شروع کی۔ چونکہ وہ بیک وقت تین طرف متوجہ تھی (۱) گریہ و زاری آہ و بکا (۲) مصیبت کی کہانی کا بیان اور (۳) دامن کی گرہ کشائی۔ اس وجہ سے ہمارے پلّے تھوڑا ہی کچھ پڑا اور اس کی پوری بات ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔ حتیٰ کہ اس نے گرہ سے کھول کر ایک اٹھنی اس نے اپنی انگلیوں میں تھامی اور بصد لجاجت

ہر

ایک کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ لے لو اور میرے بیٹے کو کہیں سے پکڑ لاؤ۔ وہ بھاگ گیا ہے۔ بہت تلاش کی۔ سر مارا مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ گیا بٹالے۔ اگر کفرستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میں زندہ ہی مر مٹوں گی وغیرہ۔

پھیلاں کی بات اب کچھ ہماری سمجھ میں آئی۔ مطلب اس کا سمجھ کر اسے حضرت کے حضور عرض کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ وہ دوڑی گئی۔ حضرت آرام فرما رہے تھے۔ اس کی تکلیف اور بے قراری کی تاب نہ لا کر حضرت آپ بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مطلب پا کر حکم بھیجا "فوراً جاؤ۔ محمد دین جہاں کہیں ملے پکڑ لاؤ"۔ اور خود اس کو تسلی دی۔ اطمینان دلایا۔ حوصلہ کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بیٹا تمہارا جا نہیں سکتا آجائے گا۔ ہم لوگ حکم پاتے ہی کھڑے ہو گئے۔ جو جس حال میں تھا بھاگ نکلا۔ کوئی سر سے ننگا بھاگا، کوئی پیر سے، ہر کسی کو یہی خیال تھا کہ وہ پیچھے نہ رہ جائے۔ گرمی کا خیال نہ دھوپ کی پرواہ، مارا مار کرتے ہوئے دوڑے۔ تھوڑی دور ایک آگے لگتا اور کچھ دور جا کر دوسرا اس کی جگہ لے لیتا اور اس طرح ادلتے بدلتے موڑ تک پہنچے۔ نہر پر پہنچے۔ آخر وڈالہ بھی آگیا۔ مگر محمد دین کا پتہ نہ لگا۔ حکم ہمارے آقا کا تھا اور قوت بھی ہمیں وہیں سے مل رہی تھی۔ تکان معلوم ہوئی نہ گرمی بلکہ امید بھرے دل سے ہمارے قدم برابر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے اور زمین ہمیں لپٹتی معلوم دے رہی تھی۔ امیر اس قافلہ کے مرحومی محترم بھائی عبدالرحیم صاحب اور شیخ عبدالعزیز صاحب (نومسلم) ایک صاحب چودھری نورالدین نام اور خاکسار راقم عبدالرحمن قادیانی یہ چار نام تو مجھے ایک اور ایک دو کی طرح یاد ہیں۔ ایک صاحب اور کے متعلق مجھ شبہ ہے مگر ان کا نام یاد آتا ہے نہ اتا پتا۔

پورے چھ میل کی سرگرم دوڑ کے بعد جب کہ ہم لوگ وڈالہ سے اس پار کی ریت کے بلند ٹیکروں پر پہنچے۔ امید کی شعاع اور جھلک ہمیں نظر آئی اور ایک مجسمہ کو ہم نے محمد دین فرض کر کے زیادہ تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ جوں جوں ہم اس کے بت کے قریب ہوتے گئے ہمارا خیال یقین سے بدلتا گیا۔ حتی کہ جب ہم پوری شناخت کی حدود میں داخل ہو کر حق الیقین تک پہنچ گئے اور محمد دین نے بھی تاڑ لیا کہ اب وہ پکڑا گیا۔ بھاگنے اور چھپ جانے کی کوئی راہ نہ پا کر سڑک چھوڑ کر ایک طرف ہو کر رفع حاجت کے طریق پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ غالباً اس کا گمان یہ تھا کہ ہم لوگوں نے اسے پہچانا نہیں اور اس طرح راستہ سے ایک طرف ہو کر گویا وہ ہم سے پوشیدہ ہو گیا ہے۔

ہم لوگ کنویں پر پہنچ کر رک گئے۔ جہاں ایک پختہ کمرہ کے علاوہ سڑک کے کنارے اور کنویں کے گرد توت کے چند سایہ دار درخت لگے

ہوئے تھے اور قادیان سے بٹالہ جانے والی سڑک کے بائیں جانب یہ مقام واقع ہے۔ نام اس کا مجھے معلوم نہیں۔ موقعہ کے لحاظ سے یہ جگہ دیوانی وال کے تکیہ اور وڈالہ کے قریباً وسط میں واقع ہے۔ ہم نے میاں محمد دین کی انتظار کی مگر وہ اٹھنے ہی میں نہ آئے۔ مجبور ہو کر خود حاضر ہوئے اور عرض معروض کر کے اٹھایا جہاں وہ محض بہانہ بنائے بیٹھے تھے۔ بہت سخت کرخت بولے اور ہم سب کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے۔ گالی گلوچ اور سبّ و شتم کے علاوہ دھمکیوں کا بھی انبار لگا دیا۔ مگر ہماری طرف سے نرمی، حکمت، منت سماجت اور خوشامد درآمد کا سلوک پا کر آخر نرم تو ہو گئے مگر لوٹنے کی بجائے آگے ہی بڑھنے پر ضد اور اصرار رہا۔

بہزار منت و لجاجت، پیار سے، دلاسہ سے، نرمی سے، گرمی سے، کہہ سن کر مٹھی چاپی اور خدمت و حکمت سے واپسی پر رضامند کیا تو تکان کا عذر اور پیدل نہ چل سکنے کا بہانہ بنا کر بیٹھ رہا۔ ٹالنے اور وقت گزارنے کی کوشش کرتا رہا اور اس دوران میں ہم نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بار بار بٹالہ کی طرف اٹھتی تھیں جیسے کسی کی انتظار ہو۔ اس خطرہ کو بھانپ کر ہم نے اسے پیٹھ پر اٹھایا کہیں پیدل چلایا۔ ایک چادر کے کونے پکڑ کر اس کے لئے سایہ اور دھوپ سے بچاؤ کا انتظام کیا اور اس طرح بصد مشکل کو وڈالہ تک لے چلے۔ پیچھے مڑ کر جو کسی نے دیکھا تو ایک یکہ آتا دکھائی دیا۔ جس کو دیکھ کر بیم و رجا اور خوف و امید یکجا جمع ہو گئیں۔ خطرہ یہ تھا کہ بٹالہ مشن کے ساتھ اس کی ساز باز تھی۔ مبادا وہی لوگ اس کی تلاش اور استقبال کے لئے آتے ہوں۔ کیونکہ اس کے بھاگ نکلنے کا طریق وضع اور ہیئت ترکیبی کسی منصوبہ و سازش کا پتہ بتا رہی تھیں۔ اسی کشمکش میں وہ یکہ قریب ہوا اور خدا کے فضل سے ہماری امید خطرہ پر غالب ہوئی۔ یکہ میں بمشکل ایک سواری کی گنجائش تھی۔ میاں محمد دین کو اس میں بٹھایا مگر چونکہ وہ لوٹنے پر رضامند نہ تھا اچھی طرح جم کر بیٹھتا نہ مضبوطی سے پکڑتا تھا۔ خطرہ اس کے گر کر چوٹ کھانے کا تھا۔ جس کی اس میں تاب تھی نہ سکت۔ ناچار یکہ والے کو کہہ سن کر ایک کو اس کے ساتھ بٹھایا تا محمد دین کو تھامے رہے اور باقی پیدل یکہ کے ہمراہ خدا کے فضل و کرم سے کامیاب و بامراد خوش و خرم لوٹے۔ قادیان پہنچے۔ ماں اس کی راہیں تکتی انتظار میں تھی۔ خدا کا شکر بجا لائی اور دوڑ کر حضرت کے حضور اس کی واپسی کی اطلاع اور خوشی کا مژدہ سنایا۔ حضرت پر نور خوش ہوئے۔ دعائیں دیں اور محمد دین کے ساتھ زیادہ نیک اور زیادہ محبت کے سلوک کی تاکید فرماتے ہوئے تشریف لے گئے۔ محمد دین کو ملامت کی نہ کچھ جتایا۔ فرمایا تو صرف یہ کہ آپ کو اگر سیر کا خیال تھا تو ہم سے کہتے۔ ہم خود اس کا

انتظام کر دیتے۔ آپ نے بے فائدہ تکلیف پائی اور زحمت اٹھائی۔ ماں کی تکلیف کا بھی آپ کو خیال نہ آیا وغیرہ۔ اس طرح پھر سے ایک مرتبہ خدا نے محمد دین کو گویا کفر کے غار سے بچا کر دارالامان پہنچا دیا اور وہ اچھی طرح رہنے لگا۔

خدا کے فضل نے جوش مارا۔ رحمت الٰہی کے دروازے کھل گئے۔ حضرت کو توجہات مقبول ہوئیں۔ دم مسیحائی میں تاثیر آئی۔ اس روحانی مردے کی زندگی کے سامان ہونے لگے۔ اس کی طبیعت نے پلٹا کھایا۔ کفر کا رنگ اور شرک کی میل دھلنے لگی اور ہوتے ہوتے آخر خدا نے وہ دن دکھایا جب

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

کی تاثیر نے اپنا اثر دکھایا۔ محمد دین کے دل کے جندرے کھل گئے۔ خدا کے فرشتوں نے اس کے سینے چاک کر کے غلاظت نکال کر ایمان کا نور بھر دیا اور اس نے صدق دل اور انشراح صدر سے خدا کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا کلمہ پڑھ کر کفر سے بیزاری اور اسلام کا اعلان کر دیا۔

پھیلاں نے سجدات شکر کئے اور خدا کی حمد کے گیت گائے۔ ہر طرف سے مبارک صد مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ روحانی مردوں کے زندہ ہونے کا مطلب اور:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

کی عملی تفسیر اور زندہ نمونہ آنکھوں نے دیکھا۔

مسلمان ہو کر بھی ماں بیٹا کچھ دن رہے۔ محمد دین نماز پڑھتا اور مسلمانی اعمال بجالاتا رہا اور وہ اب دل سے مسلمان تھا۔ آخر حضرت کی اجازت سے پھیلاں اسے اپنے وطن لے گئی۔ وہاں بھی وہ مسلمان ہی تھا۔ عیسائی پادری اب اس سے مایوس ہو چکے تھے کیونکہ وہ قادیان سے روحانی زندگی اور ایمان کا نور پا چکا تھا۔ اس طرح کچھ عرصہ وہ خوش و خرم رہا۔ آخر بیماری نے پھر زور پکڑا، غلبہ کیا اور چند روز کی بیماری کے بعد وہ بحالتِ اسلام اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

تجھ کو جاں میری قسم تو جلد واپس لوٹ آ

(وسیم احمد شاہد صاحب۔ نوشہرہ کینٹ)

جانِ دل، جانِ چمن، آنکھ کی پتلی میری
تیرے ہونے سے ہی وابستہ ہے میری زندگی
تیرے اک آنسو پہ قرباں، تیرے خادم کا وجود
تو نے بخشی ہے وطن کے رنگ و بو کو تازگی
اس وطن کی رونقیں کچھ بھی نہیں تیرے سوا

اس ادا سے آئے اب کہ عید تیرے دیس میں
کاش تیری عید گزرے تیرے اپنے دیس میں

ہجر کے موسم گواہ ہیں رات کے پچھلے پہر
جانتا تُو بھی تو ہوگا ہوگی تجھ کو بھی خبر
تیرے پروانے مجسم عجز بادیدۂ تر
کاٹتے ہیں کس طرح سے اپنے سجدوں کا سفر
اور ہوتا ہے لبوں پہ بس یہی اک مدعا

اس ادا سے آئے اب کہ عید تیرے دیس میں
کاش تیری عید گزرے تیرے اپنے دیس میں

ڈرتے ڈرتے پوچھ لوں اک بات اے جانِ وفا
اہل مغرب کی ادائیں بھاگئیں ہیں تجھ کو کیا
ہم سے سرزد ہوگئی ہے کون سی ایسی خطا؟
سات ساگر پار اتنی دور ہم سے جا بسا
تجھ کو جاں میری قسم تُو جلد واپس لوٹ آ

اس ادا سے آئے اب کہ عید تیرے دیس میں
کاش تیری عید گزرے تیرے اپنے دیس میں

شعرائے احمدیّت

فردوسئ ثانی ــــ فردِ جوہر

حضرت حکیم مولانا عبید اللہ صاحب بسملؔ

(ترتیب و تحریر:۔ احمد آیاز۔ مدیر خالد)

آپ ۱۸۳۹ء کے قریب امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والدین نے آپ کا نام "عباداللہ" رکھا مگر آپ کے استاد نے "عبیداللہ" نام تجویز کیا۔ آپ کا تخلص بسمل تھا۔ والد صاحب کا نام مظہر جمال تھا جو ایک صاحب ارشاد بزرگ تھے۔

قبول احمدیت

گو آپ سنی خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن ابتدائی تعلیم کے دوران آہستہ آہستہ آپ پر شیعیت کا رنگ چڑھ گیا اور یہی رنگ بعد میں تفضیل کے ساتھ بدل گیا۔ اور شیعہ احباب میں آپ ایک نامور عالم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اس سعید فطرت کو نور ہدایت سے منور کرنے کا جو فیصلہ کیا تو آپ نے امام مہدی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپ کا احمدیت قبول کرنا ایک کشف کی بناء پر تھا۔ یہ شہادت خود انہی کی زبانی سنیئے آپ فرماتے ہیں:۔

"ارجح المطالب" (آپ کی ایک تصنیف) کا چھپنا تھا کہ میرے ہاتھ حضرت مسیح موعود کی کتاب "سِرّ الخلافہ" آ گئی۔ اس کے مطالعہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اسی اثناء میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام تشریف لائے ہیں اور ایک اونچے مقام پر برقعہ پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ آنکھیں بہت روشن ہیں میں نے سلام عرض کیا ارشاد ہوا کہ مرزا صاحب کو کہہ دو میں آ گیا ہوں۔ میں نے عرض کیا بہت بہتر۔ اس خواب کے دوسرے دن میں لاہور سے قادیان آ گیا اور چہرہ اقدس دیکھتے ہی پروانہ وار قربان ہو گیا"۔

آپ نے احمدیت قبول کرنے کے بعد اپنے پیرو مرشد حضرت امام مہدی الزمان کی مدح کے سوا کسی کی مدح میں قلم نہیں اٹھایا یا پھر آپ نے اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کرتے ہوئے اپنے نفس کو اس کے آستانے پر گرائے رکھا اور اس کی محبت اور مغفرت کے خواستگار رہے۔

جب نواب حمیداللہ خان صاحب فرمانروائے ریاست بھوپال مسند نشین ہوئے تو ایک شاعر خوش طبع فارسی زبان کا مطلا و مذہب مدحیہ قصیدہ لائے جو انہوں نے نواب صاحب کی مسند نشینی کی تقریب سے نہایت خوش خط لکھا ہوا تھا اور ہر ایک مصرعہ سے مسند نشینی کی تاریخ نکالی ہوئی تھی۔ مولانا بسمل صاحب کو قصیدہ لاکر دکھایا اور پھر کہنے لگا کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ آپ اس وقت اپنی سوانح حیات کا مسودہ درست کر رہے تھے۔ فرمایا کہ مثنوی ہے۔ کہنے لگے کہ میں اس کو دیکھ سکتا ہوں۔ آپ نے پیش کیا۔ اس شاعر نے مثنوی کو کچھ مقامات سے پڑھا پھر کہنے لگا کہ آپ نے نواب صاحب بہادر کی مدح میں بھی کچھ لکھا۔

آپ نے آہ بھر کر کہا:۔

"مجھے اپنے نفس کی مرثیہ گوئی سے کہاں فرصت کہ مدحیہ اشعار لکھنے کی طرف توجہ کروں"۔

یہ جواب سن کر شاعر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(الحکم ۱۴ دسمبر ۱۹۳۸ء)

شاعری

آپ فارسی زبان کے نامور شاعر تھے اور فارسی کے اہل زبان شعراء نے آپ کے کلام کو خراج تحسین پیش کیا۔ لیکن فارسی کے اس شاعر کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح نے جن تعریفی کلمات کے تاج سے نوازا ہے وہ مولانا بسمل صاحب کو تمام شعراء سے ممتاز و منفرد مقام پر فائز کئے ہوئے ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کو "فردوسیٔ ثانی" کے لقب سے سرفراز فرمایا اور حضرت مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح الاول نے آپ کے فارسی تبحر کو دیکھ کر فرمایا کہ جس قدر بسمل فارسی جانتا ہے کاش مجھ کو ایسی عربی آجائے۔

آپ کی تصنیفات اور شعری محاسن پر کچھ کہنے کے لئے خاکسار کتب و رسائل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر مرحوم جو خود فارسی زبان کے ایک بزرگ شاعر بھی تھے ان کا ایک مضمون "الفرقان" نومبر ۵۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، مل گیا۔

وہی مضمون قدرے ترمیم کے بعد نذر قارئین ہے

حضرت شیخ صاحب فرماتے ہیں:۔

"مجھے فرمایا گیا تھا کہ غالب یا عمر خیام کے فارسی کلام کے متعلق کچھ بیان کروں۔ لیکن یہ مضمون اگر فرسودہ نہیں تو کم از کم عام اور متداول ہو چکا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی بجائے مولانا بسمل کے کلام کے متعلق بعض خیالات پیش کروں اور کتاب کی بات کہنے کی بجائے آنکھوں دیکھی اور تجربہ میں آئی ہوئی بات سناؤں۔

وَلَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ

گو ہندوستان کا اہل علم طبقہ بسمل کے علم و فضل اور شاعری کا قائل ہے۔ لیکن ایک عام آدمی کے نزدیک فارسی زبان کی ناقدری کی وجہ سے یہ آفتاب علم و فضل بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اس لئے اس بھولے بسرے مضمون کو میں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور بسمل کے کلام اور سیرت کا ایک ورق اس مضمون میں پیش کروں گا۔

آپ نے بمبئی میں ایرانیوں سے فارسی سیکھی اور شہروں میں متعدد اساتذہ سے فارسی اور عربی ادب اور علم طب کی تکمیل کی۔ اور پھر رامپور، بھوپال اور حیدر آباد دکن میں کتب خانوں کے مہتمم مقرر رہے۔ آپ کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا لائبریریاں اپنے سینے کے اندر ڈال لی ہیں اور آپ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ علم مناظرہ، منطق، فلسفہ، فارسی، عربی ادب، دنیا کے مذاہب کی تاریخ سب پر عبور حاصل کیا۔ شاعری کی لیکن وہ شاعری نہیں جسے حق تعالیٰ نے فی کل واد یھیمون قرار دیتا ہے۔ بلکہ شاعری جسے اس علام الغیوب نے الا الذین امنوا کے استثناء سے نوازا ہے۔

کشمیر میں ایک شخص بڑے علامہ ہوئے ہیں۔ ان کا تخلص شعری تھا۔ علم شعر میں بسمل نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ فرماتے ہیں:۔

بود در شعر شعریِ کشمیر
خضر رہ، رہنما و رہبرو پیر

لیک کردم براہِ کج رفتار
ننگِ استاد گشتم آخرِ کار

(ترجمہ:۔) کشمیر میں ایک شاعر تھے جن کا تخلص شعری تھا، وہ اتنے بزرگ تھے کہ گویا خضر کے بھی راہ نما تھے وہ میرے راہبر تھے اور استاد تھے۔ (اور پھر اپنی انکساری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں) لیکن میں نے اپنی کج رفتاری کے باعث اپنے استاد کو بھی بدنام کیا اور میرا وجود ان کے لئے باعثِ ننگ و عار بن گیا۔

آپ کی علمی فضیلت کی بابت چند باتیں یادگار ہیں۔

آپ پہلے سنی تھے۔ پھر شیعہ ہوئے لیکن کامل تحقیق کرنے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت میں داخل ہوئے اور حضرت صاحب کے سامنے اپنے اخلاص کے اظہار میں ایک نظم پیش کی۔ جسے سن کر حضرت صاحب نے آپ کے کلام کو فردوسی کا ہمرنگ قرار دیا۔ بسمل اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

از مسیح اللہ گشتم فیضیاب
یافتم فردوسیِ ثانی خطاب

(ترجمہ:۔) خدا نے میری مدد کی اور مجھے اپنے مسیح کے قدموں میں پہنچا دیا اور ان سے میں نے "فردوسی ثانی" کا خطاب پایا۔

ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بسمل ایسے فاضل شخص کا احمدیت میں داخل ہونا بجائے خود احمدیت کی صداقت کے ثبوتوں میں سے ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا قول ہے کہ عبیداللہ فارسی زبان کا بے نظیر عالم ہے۔

اہل ایران اہل ہند کی شاعری کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ جس طرح کہ لکھنؤ اور دلی والے اہل پنجاب کی اردو دانی کے قائل نہیں ہوتے۔ علی حزین کے متعلق مشہور ہے کہ جب ان کے پاس مثنوی غنیمت کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا:۔

"غنیمت از پوچ گویان ہند غنیمت است"

غرضیکہ اہل ہند کی فارسی اور ان کی شاعری کو مستند نہیں جانتے۔ لیکن ایران کا ملک الشعراء سنجر جب ہندوستان آیا تو مولانا بسمل کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس لئے سنجر اور بسمل میں ملاقات ہوئی اور بسمل کے کلام کو دیکھ کو وہ بے اختیار کہہ اٹھا:۔

"واللہ من بہتر از و نتوانم گفت"

اور سنجر نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ بسمل کی تصانیف موجود ہیں۔ آپ شروع سے آخر تک مطالعہ کر جائیں کہیں کوئی لفظ، محاورہ اور بندش غیر ایرانی نظر نہیں آئے گی۔ اور یہ وہ کمال ہے جو کم کسی ہندی کو نصیب ہوا ہے۔

خاکسار کے ایک استاد تھے۔ بڑے فاضل اور شاعر وہ یہ مانتے ہی نہیں تھے کہ بسمل ہندی ہے۔ اور مجھ سے بحث کرتے تھے کہ عبیداللہ بسمل تو ایرانی شاعر ہے۔ اور کہتے کہ میں نے ان کا کلام دیکھا ہوا ہے۔ ہندی کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

اس خصوصیت کے علاوہ آپ کے کلام کی چند خصوصیات یہ ہیں۔

اول: شعراء خصوصاً فارسی شعراء اپنے مفاخر بیان کرنے اور اپنی علمی برتری کا ذکر کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور "یَجُوْزُ لِلشَّاعِرِ مَالَا یَجُوْزُ لِغَیْرِہٖ" اس کی سند پیش کرتے ہیں۔ عرفی کے قصائد اپنے ذاتی مفاخر میں آپ نے شاید دیکھے ہوں۔ یہی حال باقی شعراء کا ہے۔ لیکن اسکے بالکل برعکس بسمل کا کلام اول سے آخر تک خود ستائی سے پاک ہے ہزاروں اشعار میں کہیں ایک شعر بھی نہیں ملے گا جہاں آپ نے کوئی فخریہ بات کہی ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بالکل خلاف آپ کے اشعار میں عجز و الحاح، آہ و بکا، خود شکنی اور نفس کشی اور اپنی ہیچ مدانی اور ہیچ میرزی کا اعتراف جا بجا نظر آئے گا۔

نامور نامدار بدنام

ہر قدر پختہ آں قدر خام

(ترجمہ:-) میں بہت مشہور ہوں لیکن حقیقت میں بدنام، جس قدر میں ظاہری طور پر پختہ ہوتا گیا اتنا ہی مجھے اپنی خامی کا احساس ہوتا گیا۔

اور آپ ان کو ایک بالکل جداگانہ روش پر گامزن دیکھیں گے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بہت ہی پیاری اور دلربا شعر گوئی آپ کو نظر آئے گی۔ انسان بناوٹ سے بھی منکسر المزاج بن سکتا ہے لیکن یہاں یہ بات نہیں بلکہ ان کا انکسار طبعی اور جبلی ہے۔ مثلاً قصیدہ نعتیہ میں کہتے ہیں:-

خویش را در یثرب از ہندوستاں آوردہ ام
دوزخے را دربہشتِ جاوداں آوردہ ام

زرد روئی از ندامت روسیاہی از گناہ
طبلہ مشک و تنگِ زعفراں /آوردہ ام

جرم بیروں از حساب و فسق افزوں از شمار
آنچہ کس نارد بدرگاہ توآں آوردہ ام

خام طبعے، سست خوئے، اجر جوئے، بے عمل
خود غرض، مبرم گدائے ناتواں، آوردہ ام

(ترجمہ:-) میں نے اپنے آپ کو ہندوستان سے مدینہ میں پہنچا دیا، گویا کہ دوزخ کو بہشت میں پہنچا دیا۔ میں ندامت کی وجہ سے شرمندہ ہوں اور گناہوں کی وجہ سے روسیاہ ہوں۔ گویا کہ نہ میں مشک کی ڈبیہ لایا ہوں اور نہ ہی زعفران کی بوری۔ (''زرد روئی'' کی رعایت سے زعفران اور ''روسیاہی'' کی رعایت سے مشک کا لفظ لائے ہیں)

میرے جرائم بے شمار ہیں اور میرے گناہ بے حساب، میں وہ چیز آپ کی جناب میں لایا ہوں جو کوئی نہیں لاتا۔

میں خام طبع ہوں، عادتیں خراب ہیں اور کسی بھی عمل (نیک کام) کے نہ ہونے کے باوجود میں اجر کا خواستگار ہوں۔ خود غرض ہوں لیکن (تیرے در کا) ایسا فقیر ہوں کہ (تیری محبت و بخشش کی خیرات لئے بغیر) نہیں ٹلوں گا۔

اسی قسم کے سینکڑوں اشعار خود بینی کی بجائے خود شکنی کے متعلق آپ کو ملیں گے۔

دوم: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے آپ کی نظر مذاہب عالم پر بسیط تھی۔ اور عربی اور فارسی علم ادب اور تاریخ پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے آپ کے کلام میں جا بجا تاریخی واقعات اور تلمیحات پائی جاتی ہیں۔

سوم: بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہوں۔ لیکن بسمل جب فارسی شعر لکھتے ہیں اور طبیعت کا رخ پلٹتا ہے تو اسی زمین میں عربی اشعار بھی بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔

چہارم:- بعض دفعہ آپ کی منطقی گرفت بہت

سخت ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ حضرت علی کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ اور علی اللّٰہی کہلاتے ہیں۔

بسمل فرماتے ہیں:۔

پور بو طالب از خدا باشد
ابن ملجم بگو چہا باشد

(ترجمہ:۔) ابو طالب کے بیٹے (حضرت علیؓ) خدا تھے، پھر کہو کہ ابن ملجم جس نے آپ کو قتل کیا تھا وہ کیا کہلائے گا؟ (یعنی اگر حضرت علیؓ نعوذ باللہ خدا تھے تو کیا ابن ملجم نے خدا کو قتل کیا؟)

(ب) اسی طرح بہائی لوگ بہاء اللہ کو خدا مانتے ہیں۔ بسمل فرماتے ہیں:۔

تو بہا را اگر خدا دانی
ناصر الدین را چہار خوانی

(ترجمہ:۔) تو اگر بہاء اللہ کو خدا سمجھتا ہو تو پھر ناصر الدین (قاچار بادشاہ) کو کیا کہتا ہے (کہ جس نے بہاء اللہ کو جلاوطن کر دیا تھا۔)

کیونکہ ناصر الدین شاہ ایران نے بہاء اللہ کو قید و بند میں ڈال دیا تھا۔

(ج) احمدیوں کو لوگ طنزاً میرزائی کہتے ہیں اور میرزا دراصل سردار زادہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے بسمل اس لفظ کی حسن تعلیل میں فرماتے ہیں

در غلامی میرزائی نام یافت
بند گیش خواجگی انعام یافت

یعنی مسیح موعود علیہ السلام کی غلامی اور خدمت گری کے طفیل غلام ہو کر امیر اور سردار کہلاتا ہوں۔

(د) عیسائیت رہبانیت سکھاتی ہے اور اسلام اہلی اور تمدنی زندگی کی تعلیم دیتا ہے فرماتے ہیں:۔

گفت عیسیٰ زخانہ دل بردار
گفت احمد بہ خانہ دلبردار

(ترجمہ:۔) عیسیٰ تو یہ کہتا ہے کہ گھر سے دل کو نہ لگاؤ لیکن احمد یہ کہتے ہیں دل کے گھر میں محبوب حقیقی کو آباد کرو۔

(ہ) ایک شاعر نے احمدیت کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا۔ بسمل نے جواباً ایک قطعہ لکھا۔ اور ایک ایسا استادی کا ہاتھ مارا کہ باید و شاید۔

(و) احرار کی شورش کے زمانے میں ۱۹۳۷ء کے قریب آپ نے قریباً ڈیڑھ صد اشعار کی ایک نظم لکھی۔

(ز) خدمت اسلام کی ضرورت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

شیخِ قوم از خادم اسلام نیست
خنجر چوبیں است او صمصام نیست

طریق اصلاح شعر

آپ اپنے شاگردوں کا پورا اکرام بلکہ احترام فرماتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں عجز و انکسار رچا ہوا تھا اس لئے شعر کی اصلاح میں بھی یہ بات نمایاں تھی۔ مثلاً غلط لفظ کو قلمزد نہیں فرماتے تھے بلکہ حاشیہ پر صحیح لفظ لکھتے اور فرماتے۔ مشورہ عرض ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس میں شاگرد کی کس قدر دلداری اور حوصلہ افزائی ہے کہ اصلاح دہندہ کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ اس کے نزدیک حاشیہ پر لکھا ہوا لفظ بہتر ہے۔ گو اسے اس پر ناز یا اصرار نہیں۔ یہ نہایت دلرباء اور نیک طریق تھا۔

دوم: جو شعر عمدہ ہوتا اس کے کنارے پر ایک صاد لکھتے۔ اگر بہتر ہو تو دو صاد۔ اور اگر شعر بہترین ہو تو تین صاد اور اگر شعر ہر لحاظ سے مکمل اور مضمون کو ختم کرنے والا ہو تو چار صاد لکھتے اور بس۔

سوم: استادوں کی بابت سنتے ہیں کہ ایک نقطے یا شعشے کی کمی بیشی سے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اور دار صل یہ فن شعر اور زبان پر قدرت کا کمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "چو" کی بجائے "ز" کے لفظ نے مضمون کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ شعر تھا:-

کہ یک بیذقے رشک فرزیں بود
جو لے بہ بہیں مفتیٔ دیں بود

(ترجمہ:-) ایک پیادہ ایک سوار سے بڑھ کر کیسے ہو سکتا ہے، دیکھو ایک جاہل کیسے دین کا مفتی بن سکتا ہے۔ (پیادہ، سوار شطرنج کے مہرے مراد ہیں)

اب ظاہر ہے کہ ببیں محض حشو ہے۔ آپ نے ببیں کو ایک شعشہ دیکر بہیں بنا دیا اور مصرعہ یوں بن گیا:-

"جو لے بہیں مفتی دیں بود"۔

یعنی پرلے درجے کا جاہل پرلے درجے کا مفتی بن بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ حشو نکل گیا اور مضمون مکمل ہو گیا۔

چہارم: اصلاح کر کے نظم جب دیتے تو بڑے ادب سے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر کھڑے ہو کر پیش کرتے کہ لیجئے یہ مشورہ عرض ہے آپ کی یہ انکساری دلوں کو موہ لینے والی تھی۔ دل اس کا احساس رکھتا ہے لیکن زبان قلم اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتی۔

سیرت

آپ کی سیرت کا نمایاں اور ممتاز پہلو جو آپ کی عملی زندگی میں اور تصانیف میں ابھرا ہوا نظر آتا ہے یہ ہے۔

اول: اگر آپ بسمل کے ساتھ رہیں تو ان کی کسی بات سے انکی علمی فضیلت کا پتہ آپ کو نہ مل سکے گا۔ اہل محلہ بھی اس بات سے ناواقف تھے کہ ہمارے پڑوس میں ایک بے نظیر شاعر اور متبحر عالم بستا ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو نمائش اور ریا سے بے حد نفرت تھی:-

دوم: دراصل اس قسم کا انکسار کامل علمی و دستگاہ کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ کم ظرف آدمی تھوڑے سے علم پر غرہ ہو جاتا ہے اور یہ بات ترقی اور حصول کمال کے راستے میں بجائے روک بن جاتی ہے۔

اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں کہیں کوئی فخر کا اظہار نام کو بھی نہیں۔

سوم: شاعری کو لوگ ذریعہ شکم پروری بناتے ہیں کسی نے کہا ہے:-

سہ چیز رسم بود شاعران طامع را
یکے مدیح و دوم قطعہ تقاضائی

اگر بداد وسوم شکر ورنہ داد ہجا
من ایں دو گفتہ ام اکنواں وگرچہ فرمائی

یعنی شاعر کا قاعدہ ہے کہ قصیدہ لکھے۔ انعام نہ ملے تو تقاضا کے لئے قطعہ لکھے۔ کچھ مل گیا شکر ورنہ ہجو لکھنے سے شاعر نہیں چوکتا۔

آپ کا ذریعہ معاش طبابت یا ملازمت رہا۔

اس لئے آپ نے شعر سے کبھی کوئی نفع حاصل نہیں کیا نہ ہی تصانیف سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ بلکہ اکثر کتابیں چھپوا کر مفت بانٹ دیتے باوجود کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ القصہ علم کے لئے علم کی خدمت کرتے تھے نہ کہ کسی جلب منفعت کے لئے۔

آپ کی تصانیف

آپ کی تصانیف دس کے قریب ہیں۔

اول- فارسی بول چال:- یہ کتاب سکول کے مبتدیوں کے لئے آپ نے لکھی اور بلوچستان کے سکولوں میں عرصہ تک یہ کتاب ٹیکسٹ بک رہی۔

دوم- ترجمان پارسی:- یہ بھی فارسی زبان کے قواعد اور آداب سکھانے کے لئے ایک بہت مفید کتاب ہے۔ جس پر یونیورسٹی نے ۳۰۰ روپیہ آپ کو انعام دیا اور اس کے بعض حصے فارسی کے کورسوں میں داخل ہوئے۔ یعنی سرمایہ خرد- پیرایہ خرد وغیرہ میں۔

سوم- ارجح المطالب:- حضرت علیؓ کی سوانح حیات اور مناقب میں ایک بے نظیر کتاب ہے۔ شیعہ ہونے کی حالت میں آپ نے یہ کتاب لکھی اور ہندوستان بھر میں اس کتاب کی وجہ سے مصنف کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ دیکھنے والی بات یہ

ہے کہ ایسا فدائی شیعہ کامل تحقیق کے بعد احمدی ہوگیا اور لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ابح المطالب کا مؤلف ہو اور احمدی ہو جائے اور رامپور کے لوگوں کے ظلم و ستم کو بخوشی برداشت کرلے۔

چہارم۔ مسدس مدوجزر اسلام:- ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسدس حالی کی اشاعت ہوئی اور مسلمانوں کے عروج کے بعد ان کے زوال کا نوحہ حالی نے پڑھا۔ اسی مضمون پر فارسی میں بسمل نے قلم اٹھایا اور حق بات یہ ہے کہ اس مضمون کا پورا حق ادا کیا۔ اس مسدس کے ۱۳۶ بند یعنی ۸۰۸ اشعار ہیں۔ ہر شعر بے بدل ہے۔

پنجم۔ مرآت اسلام:- ایک عالی قدر نظم ہے۔ مضمون نام سے ظاہر ہے۔

ششم۔ خاتم النبین:- مثنوی ہے۔ جس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت بیان کی گئی ہے اور علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر زوجہ مطہرہ کے اوصاف و مناقب نظم کئے ہیں۔ اس میں آپ نے یہ بات رکھی ہے کہ ہر مضمون کے بعد ممدوح یعنی ہر ام المومنین رضی اللہ عنہا سے درخواست کرتے ہیں کہ بسمل کی مغفرت کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور سفارش کریں۔

اس کے بعد خلفائے راشدین، حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور قادیان کی مدح و توصیف میں عالی قدر مضمون نظم کئے ہیں۔

ہفتم۔ حیات بسمل:- مثنوی ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلو منظوم کئے گئے ہیں۔ نمونہ کلام ... مناجات میں کہتے ہیں:-

اے خدا گرچہ عذرِ من لنگ است
نالہ ام نیز خارجِ آہنگ است

دستِ موسیٰؑ زِتو نمے خواہم
دمِ عیسیٰؑ زِتو نمے خواہم

لحنِ داؤدؑ ہم نمے خواہم
معجزِ ہودؑ ہم نمے خواہم

صبرِ ایوبؑ ہم نمے خواہم
حزنِ یعقوبؑ ہم نمے خواہم

ملک داری زِتو نمے خواہم
شہر یاری زِتو نمے خواہم

تاجِ شاہی زِتو نمے خواہم
کجکلاہی زِتو نمے خواہم

تختِ طاؤس را نمے خواہم
بختِ کاؤس را نمے خواہم

جامِ جمشید ہم نمے خواہم

جامِ جمشید ہم نے خواہم
طشتِ خورشید ہم نے خواہم

جاہِ کیخسروی نے خواہم
مملکتِ خسروی نے خواہم

صولتِ سنجری نے خواہم
دولتِ اکبری نے خواہم

من بدخشاں زِتو نے خواہم
بحرِ عماں زِتو نے خواہم

ہندو سندو عرب نے خواہم
مصر و شام و حلب نے خواہم

آسمان و زمیں نے خواہم
از تو عرشِ بریں نے خواہم

ان اشعار میں بڑے بڑے دنیاوی جاہ وحشمت اور انعامات کا اور معجزات کا ذکر کیا ہے کہ خدایا میں تجھ سے یہ نہیں مانگتا اور پھر کہتے ہیں۔

از تو خواہم کہ یارِ من باشی
مونسِ جانِ زارِ من باشی

وقتِ مردن بیادِ من آئی
در دل بے مرادِ من آئی

از بدن چوں رواں رواں گردد
نامِ پاکِ تو در دہاں گردد

میں تجھ سے اگر مانگتا تو صرف یہ کہ تو میرا دوست یار جانی بن جائے اور میری جان زار و نزار کا مونس غمخوار بن جائے۔

مرتے وقت مجھے اگر کسی کی یاد آئے تو صرف تیری یاد آئے اور میرے بے مراد دل میں تو آجائے۔

اور میرے بدن سے جب روح کے پرواز کرنے کا وقت آئے تو میری زبان پر صرف تیرا نام ہو۔

اشعار مذکور سے قدرت کلام، علم قافیہ پر کامل دستگاہ اور مصنف کی زندگی کا مقصود ظاہر ہے۔ اشعار کیا ہیں ایک امڈا ہوا دریا ہے۔

ہشتم۔ حق الیقین فی معنی خاتم النبیین:۔ اردو نثر میں ہے۔ لفظ خاتم النبیین پر بڑی سیر حاصل صرفی، نحوی اور منطقی بحث ہے۔ بہت لاجواب کتاب ہے۔

نہم۔ قصیدہ نعتیہ:۔ ۱۹۷ اشعار ہیں۔ رنگ سخن یہ ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ کے متعلق عرض کرتے ہیں:۔

در فقیری شہر یارے درشہی پیغمبرے
داور منبر نشیں، درانشاں، آوردہ ام

گر بگوئی برترش از دیگراں آور دہ
بے گماں آوردہ ام بے شبہ ہاں آوردہ ام

آوردہ ام، متکلم کی ردیف اختیار کر کے

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و اوصاف سیرت و تعلیم اس قصیدے میں بیان کرنا ایک کمال ہے۔ قاآنی کا ایک قصیدہ اسی زمین میں موجود ہے۔

دہم۔ قند پارس:۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خاکسار کی درخواست پر یہ مثنوی آپ نے لکھی اور آپ کے وصال کے بعد طبع ہوئی۔

یازدہم:۔ مختلف اوقات میں آپ نے جو قصائد اور نظمیں لکھیں ان کا ایک مسودہ خاکسار کو مل گیا تھا۔ باقیات بسمل کے نام سے میرے پاس موجود ہے۔

دوازدہم:۔ کشتی نوح کا فارسی ترجمہ آپ نے کیا تھا۔ کسی دوست کے پاس موجود ہے۔ مجھے باوجود کوشش نہیں مل سکا۔

سیزدہم:۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب تذکرۃ الشہادتین کا ترجمہ حضرت صاحب کے زمانہ میں بسمل نے کیا۔

غرض یہ ہیں بسمل مرحوم۔ علم و فضل کے آفتاب۔ فن شعر میں کامل۔ اخلاقی اعتبار سے پیکر انکسار۔ بے غرض، روبخدا۔ احمدیت کے دلدادہ، جہاں استاد، شہرت سے نفور اور ایسے عاجز طبع کہ خود ہماری جماعت میں بھی بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں ایک ایسا استاد فن اور باکمال شخص پیدا ہوا ہے۔ جس کا بدل ہندوستان میں گزشتہ صدی میں کوئی نظر نہیں آتا۔ سو سال کی عمر پائی اور مقبرہ بہشتی میں تربت گزیں ہوئے یعنی ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء میں۔

اور میری اس تمام تقریر سے غرض یہ ہے کہ ہم علماء کی یاد کو تازہ رکھیں اور ان کے اخلاق اور علمی نمونوں کی پیروی کریں اور احمدی علمی میدانوں میں سب سے آگے رہیں۔ کیونکہ حصول علم کے جو مواقع اور سہولتیں ہمیں حاصل ہیں وہ دوسروں کو میسر نہیں۔ واللہ الموفق۔

نوٹ:۔ اس مضمون میں مذکور فارسی اشعار کا ترجمہ ''الفرقان'' میں نہیں تھا۔

"تم اپنے اخلاق میں عادات میں ایک نمایاں تبدیلی کرو" (حضرت مسیح موعود۔۔۔۔)

ویڈیو فلمز ـــــ بطور تفریح

(مکرم پروفیسر راجا نصراللہ خان صاحب)

اللہ تعالیٰ کے فضل سے سائنس کی مختلف ایجادات نے روزمرہ کی زندگی کو بہت آرام دہ، محفوظ اور آسان بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں ان ایجادات کی قدر کرنی چاہیئے اور ان سے جائز اور مناسب رنگ میں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں انسانی فطرت میں قدرت کی طرف سے نیکی کا میلان رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود انسان میں برائی کی طرف جھکنے کی بھی صلاحیت اور آزادی موجود ہے۔ اچھے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی استعدادوں کو نیک راہوں میں استعمال کرے اور اپنے دین و دنیا دونوں کو سنوارے۔ اسی طرح سائنس کی ایجادات ہیں۔ ان کا صحیح استعمال سراسر فائدہ بخش ہوتا ہے لیکن ان کا غلط استعمال بہت نقصان دہ بلکہ تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

میڈم کیوری کے کام کی مثال

مندرجہ ذیل بیان کو واضح کرنے کے لئے میڈم کیوری اور ان کے خاوند پائری کیوری کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ ان دو نامور سائنسدانوں نے سائنس کی خدمت اور ترقی کے لئے نہایت نامساعد حالات میں دن رات محنت کی اور یہاں تک عہد کیا کہ جب ان میں ایک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا ساتھی بچھڑنے والے جیون ساتھی کے غم میں ہلکان ہونے کی بجائے سائنس کی خدمت پوری ہمت اور ایثار سے جاری رکھے گا۔ ان کی انتھک محنت سے بالآخر ریڈیم دریافت ہوئی جس نے ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا اور اس سے کئی قسم کی مفید ایجادات میں مدد ملی۔ ایٹمی توانائی اور ترقی اسی دریافت کی مرہون منت ہے لیکن اس کا غلط استعمال کرکے انسان نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا ڈالا بلکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے تو دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم سے جاپان کی ہولناک تباہی کا کام بھی لیا۔ ظاہر ہے ایٹم کے اس غلط استعمال کی وجہ سے ہم میڈم کیوری کو الزام نہیں دے سکتے۔ اس نے تو سائنس کی خدمت اور انسان کے فائدہ کے لئے انتھک محنت کی۔ اس کی

ان خدمات کا اعتراف بھی خوب کیا گیا۔ چنانچہ میڈم کیوری وہ خوش قسمت سائنسدان ہے جسے دو بار نوبیل پرائز (NOBEL PRIZE) ملا۔ ایک دفعہ فزکس میں اور دوسری بار کیمسٹری میں۔ ثابت ہوا سائنسی ایجادات بذات خود بری نہیں بلکہ ان کا غلط استعمال ان کو مضر اور خطرناک بناتا ہے اور یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

ویڈیو فلمیں

یہی حال ویڈیو فلموں کا ہے۔ ویڈیو کیسٹ نہایت اعلیٰ درجہ کی ایجاد ہے۔ جسے علمی ترقی، ذہنی بالیدگی اور عمدہ تفریح کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بیرونی دنیا میں عام طور پر اور ہمارے ملک میں خاص طور پر اس کا استعمال منفی طور پر ہوا ہے اور اس کا زیادہ تر مقصد بے مہار اور غلط قسم کی تفریح سمجھ لیا گیا ہے۔ جیسے بے ہودہ اور فحش قسم کے مناظر، مکالمے اور ناچ گانے نیز جرائم کی تشہیر و تفصیل پر مشتمل ویڈیو فلمیں دیکھ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ فلمیں خصوصاً نوجوان نسل کے اخلاق کو تباہ کرتی ہیں۔ ان کو جنسی بے راہ روی پر اکساتی ہیں اور مادر پدر آزاد بننے کا سبق دیتی ہیں۔ ظاہر ہے ان چیزوں کی صحیح انسانی فطرت کبھی تائید نہیں کر سکتی اور دین حق اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۴ میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے "کان اور آنکھ اور دل ان سب چیزوں کے متعلق پوچھا جائے گا"۔ یعنی آپ کے کان جو کچھ سننے کے عادی اور شائق ہیں۔ آنکھیں جو کچھ دیکھنا پسند کرتی ہیں اور دل جو کچھ محسوس کرتا اور سوچتا ہے ان سب چیزوں کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور کمی و زیادتی کا حساب ہوگا۔

اب غور فرمائیے وہ فلمیں جنہیں عام طور پر ہندوستانی یا پاکستانی فلمیں (یا اس قسم کی دوسری زبانوں کی فلمیں) کہا جاتا ہے تینوں قسم کے برے اثرات رکھتی ہیں یا نہیں۔ نوجوانوں اور بچوں کے کانوں میں بے راہ روی، جرم کی خواہش اور جنسی خیالات ابھارنے والے مکالمے اور لچر و ذومعنی گانے پڑتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بے حیائی والے مناظر اور مردوزن کی غیر اخلاقی حرکات اور قابل اعتراض و حیا سوز مناظر دیکھتی ہیں جن سے ان کے دل میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو ان کو منفی سوچ گھناؤنی عادات اور غلط راہ اختیار کرنے کی ترغیب و تحریص دیتی ہے۔ لہذا کسی بھی معاشرے کے ذمہ دار افراد اور ذی ہوش والدین ان باتوں اور نتائج کو گوارا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسی فلموں کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔

اچھی تفریحی ویڈیو کیسٹس

اس کے مقابلے میں نہایت ہی کار آمد اور دلچسپ ویڈیو کیسٹس بھی بازار میں دستیاب ہوتی ہیں اور انہی کو عام کرنا چاہیئے تاکہ ہمارے نونہال و نوجوان اچھی تفریح کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات کا بھی لطف اٹھاسکیں۔ جیسا کہ مشہور برطانوی مصنف و نقاد فلپ سڈنی نے کہا ہے کہ ادب کا مقصد تعلیم اور تفریح دونوں کا فراہم کرنا ہے۔ یہاں اچھی اور تفریحی قسم کی ویڈیو کیسٹس کا کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ سب سے اعلیٰ اور عمدہ جماعت کی تیار کردہ تربیتی، تعلیمی اور اصلاحی کیسٹس ہیں۔ جن میں سرفہرست حضرت امام جماعت احمدیہ کے خطبات اور دیگر پروگرام ہیں۔

۲۔ مہم جوئی کے موضوع پر فلمیں (پہاڑوں کو سر کرنا، مشکل علاقوں اور سمندروں کے سفر کی دلچسپ داستانیں وغیرہ)۔

۳۔ کھیلوں اور کشتیوں کے متعلق ویڈیو کیسٹس۔

۴۔ مختلف جانوروں اور پرندوں کے متعلق فلمیں جو نہایت ہی دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہیں۔ (اینیمل ورلڈ)

۵۔ بچوں کے لئے کارٹون اور ذہنی آزمائش پر مبنی دلچسپ فلمیں اور اس طرح بعض معقول مزاحیہ اور تفریحی ڈراموں کی کیسٹس۔

سب ذمہ دار اور جوابدہ ہیں

جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے نوجوان نسل کو بگاڑنے والی مخرب الاخلاق اور لغو ویڈیو فلمیں کسی بھی صحت مند اور بالغ نظر معاشرے کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری جماعت تربیت اور معیار کے لحاظ سے بہت آگے ہے لیکن جہاں کہیں کچھ کمی یا لاپرواہی دکھائی دے اس کی طرف فوراً توجہ دینے اور اصلاح کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم سب اپنی نسلوں کی صحیح رہنمائی اور تربیت بھی کرسکیں اور دوسروں کو اچھی مثال پیش کرسکیں۔ اس سلسلہ میں والدین اور دوکاندار حضرات (جو ویڈیو کیسٹس کا کاروبار کرتے ہیں) اپنی اپنی جگہ پوری پوری ذمہ داری محسوس کریں تاکہ مثبت نتائج حاصل ہوسکیں۔

والدین اس امر کا بھی خیال رکھیں کہ ان کے بچوں کی بیرونی واندرون خانہ کیا سرگرمیاں اور دلچسپیاں ہیں تاکہ ان کی تربیت بہتر رنگ میں ہو سکے۔ وہ کبھی ایسی ڈھیل یا مواقع پیدا نہ ہونے دیں کہ ان کے بچوں کو غلط قسم کی مجلس یا بے ہودہ قسم کی فلم تک رسائی حاصل ہوسکے۔ اس طرح دوکاندار حضرات بھی معاشرے، جماعتی اقدار اور سماجی و اخلاقی فرض کا احساس کریں اور اپنی قوم کے بچوں کو کوئی ایسی کیسٹ فراہم نہ کریں جو وہ خود اپنے

گھروں میں دکھانا گوارا نہیں کرتے اور جو سراسر تباہ کن اثرات کی حامل ہوں اور نوجوانوں کو غلط راہ اور سوچ پر ڈالنے والی ہوں۔ ان غلط چیزوں کے آنے اور لانے سے پہلے بھی خدا تعالیٰ نے ان کو رزق کے اسباب عطا کر رکھے تھے۔ اب بھی وہ اچھے کاروبار کی طرف توجہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں برکت ڈالے گا اور آخرت کے ثواب سے بھی نوازے گا۔ منفی کاموں سے اجتناب برتنا اور ان سے فوری طور پر رک جانا بھی اللہ کے نیک بندوں کی علامت ہے۔

قرونِ اولیٰ کی مثال

ہم سکول کے زمانہ سے یہ واقعہ سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ جب مدینہ منورہ میں شراب کی حرمت کا اعلان کیا گیا تو کیا بادہ خواروں اور کیا دوکانداروں سب نے شراب کے بھرے ہوئے مٹکے آناً فاناً توڑ ڈالے اور کسی قسم کے مالی خسارے کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی بلکہ ایک مبارک حکم کی بجاآوری کے لئے فوری عملی قدم اٹھایا۔ اس وقت کسی بھی خریدار نے یہ نہیں کہا کہ دوکاندار اور شراب خانوں کے مالک اس کاروبار کو بند کردیں تاکہ ہم بادہ خواری کو مجبوراً چھوڑ دیں اور نہ ہی کسی دوکاندار نے یہ کہا کہ گاہک ہمارے پاس نہ آئیں تو تب ہمارا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس ہر ایک نے اپنی بہتری اور کامیابی اسی بات میں سمجھی کہ ایک اچھے حکم کی فوراً تعمیل اور پابندی کی جائے۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اس موقع پر جب کسی کمزور ارادے کے شخص نے یہ رائے دی کہ پہلے تصدیق تو کرلیں کہ شراب حرام ہونے کا اعلان واقعی جاری بھی ہوا ہے یا نہیں تو دوسرے ساتھی نے فوراً جواب دیا کہ حکم کی تعمیل میں پہلے مٹکے توڑے جائیں گے اور بعد میں تصدیق کا سوچیں گے۔

اللہ اللہ! یہ وہ جذبۂ صدق و ایثار ہے جو انسان کے دل کو پاک بناتا ہے اور دوسروں کو نیک نمونہ دیتا ہے۔ اس طرح سارا معاشرہ جسم واحد کی طرح عمل کرتا ہے اور ہر فرد ایک دوسرے کا دکھ اور درد اپنا دکھ اور درد محسوس کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے، جماعت کا وقار بلند کرنے اور ایک دوسرے کا سچا غم خوار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

"اپنے مال اور بدن سے کسی کی خدمت کر دینی بھی صدقہ ہے" (حضرت مسیح موعود۔۔۔۔)

انتخابات کے حوالے سے جو بعض دلچسپ اور قابل ذکر ریکارڈز ہیں وہ گنز بک آف ریکارڈ کے حوالے سے پیش خدمت ہیں۔

دنیا کے سب سے بڑے انتخابات

دنیا کے سب سے بڑے انتخابات وہ تھے جو 20 مئی 1991ء کو بھارتی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں یا لوک سبھا کے لئے شروع کئے گئے تھے۔ اس ایوان میں انتخابی نشستوں کی تعداد 543 ہے۔ اس سال ملک بھر میں انتخابی حلقوں کی تعداد 511 تھی۔ جہاں جائز قانونی طور پر مندرج رائے دہندگان کی تعداد 48 کروڑ 86 لاکھ 78 ہزار 9 سو 93 تھی۔ جس میں سے 31 کروڑ 53 لاکھ 39 ہزار 9 سو 8 ووٹروں نے رائے دہی کا حق استعمال کیا۔ ان انتخابات میں تین سوانسٹھ سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ پورے ملک میں پانچ لاکھ 65 ہزار پولنگ اسٹیشن قائم کئے گئے تھے اور ان پولنگ اسٹیشنوں پر متعین عملے کی تعداد تیس لاکھ تھی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بھارت میں ایک نئی منتخب حکومت قائم ہوئی تھی جس کے قائد اندرا کانگریس پارٹی کے نرسمہاراؤ تھے۔

انتخابات میں سب سے کلنٹے کا مقابلہ

18 جنوری 1961ء کو زنجبار میں عام انتخابات ہوئے تھے۔ (زنجبار اب تنزانیہ کا حصہ بن چکا ہے) ان انتخابات میں دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ افروشیرازی پارٹی نے بھی حصہ لیا تھا اور یہ پارٹی ایک سخت ترین مقابلے کے بعد جیت گئی۔ افروشیرازی پارٹی کو صرف ایک نشست سے کامیابی ملی تھی۔ اور یہ نشست پیمبا جزیرے کے چاکے چاکے کی تھی۔ جس نے صرف ایک ووٹ سے کامیابی حاصل کی تھی۔

سب سے فیصلہ کن انتخابات

8 اکتوبر 1962ء کو شمالی کوریا میں عام انتخابات ہوئے تھے۔ جس میں صدفی صد رائے دہندگان نے ووٹ ڈالے تھے اور تمام کے تمام ووٹروں نے کوریا کی ورکرز پارٹی کو ووٹ دیئے۔

انتخابات کی تاریخ کی دوسری سب سے فیصلہ کن کامیابی البانیہ میں دیکھنے میں آئی۔ یہ انتخابات 14 نومبر

1982ء کو منعقد ہوئے تھے۔ انتخابات میں سرکاری سطح پر صرف کمیونسٹ امیدوار حصہ لے رہے تھے۔ ووٹروں کی کل تعداد 16 لاکھ 27 ہزار 9 سو 68 تھی اور تمام ووٹروں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا۔ تاہم صرف ایک ووٹر نے ان کمیونسٹ امیدواروں کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اس طرح صرف ایک ووٹ کی وجہ سے البانیہ کا قومی جوش و خروش ٹھنڈا پڑگیا۔ امیدواروں کو ووٹروں کی جانب سے 99.99993 فی صد حمایت حاصل ہوئی تھی۔

سب سے زیادہ انفرادی اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والا امیدوار

اب تک کسی سیاستدان کو ذاتی حیثیت میں جو سب سے زیادہ اکثریتی ووٹ ملے ہیں ان کی تعداد 47 لاکھ 26 ہزار ایک سو 12 ہے۔ یہ اعزاز بورس یلسن کو ملا تھا جو 26 مارچ 1989ء کو سابقہ سوویت یونین میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں ماسکو سے غیر سرکاری امیدوار تھے۔ ماسکو کے حلقے میں کل 57 لاکھ 22 ہزار 9 سو 37 ووٹ ڈالے گئے تھے۔ جس میں سے 51 لاکھ 18 ہزار سات سو 45 ووٹ یلسن کو ملے۔ جب کہ ان کے قریب ترین حریف کو 3 لاکھ 92 ہزار 6 سو 33 ووٹ ملے۔

1956ء میں سیلون موجودہ سری لنکا میں عام انتخابات ہوئے تھے۔ اس وقت ڈبلیو آر ڈی بندرانائیکے کو اتانگالا کے حلقے سے 45 ہزار سولہ ووٹ ملے تھے جو کل پولنگ کا 91.82 فی صد ہے۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد ہر دلعزیز وزیر اعظم بندرانائیکے 25 ستمبر 1959ء کو قتل کر دیئے گئے تھے۔ جس کے بعد ان کی بیوہ مسز سری ماؤ بندرانائیکے وزیر اعظم بنیں۔ وہ دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم تھیں۔

سب سے بڑا بیلٹ پیپر

5 مارچ 1985ء کو بھارت کے صوبہ کرناٹک میں ودھان سبھا کے صوبائی انتخابات ہو رہے تھے۔ اس صوبے کے ایک شہر بلیگام سے تین سو ایک امیدوار انتخاب میں حصہ لے رہے تھے اور ووٹروں کو ایک طویل فہرست میں سے اپنے پسندیدہ امیدوار کے نام کے آگے نشان لگانا تھا۔ اب تک یہ دنیا کا سب سے بڑا بیلٹ پیپر سمجھا جاتا ہے۔

انتخابی نتائج میں ریکارڈ دھاندلی

ہمارے یہاں تو تقریباً ہر انتخابات کے موقع پر ہارنے والا امیدوار جیتنے والے امیدوار پر دھاندلی کا الزام لگاتا رہا ہے تاہم انتخابی تاریخ کی ریکارڈ دھاندلی 1972ء میں لائبیریا کے صدارتی انتخاب کے موقع پر دیکھنے میں آئی۔ اس انتخاب میں صدر چارلس ڈی بی کنگ (1961ء-1875ء) کو اپنے مخالف امیدوار پیپلز پارٹی کے تھامس جے آر فالکز کے مقابلے میں دو لاکھ چونتیس ہزار ووٹ زیادہ ملے تھے اور اس کامیابی کا اعلان سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ تاہم یہ تعداد حقیقی معنوں میں کل ووٹروں کی تعداد سے ساڑھے پندرہ گنا زیادہ تھی۔

طویل عمر پانے والے وزرائے اعظم

دنیا بھر میں سب سے طویل زندگی پانے والے وزیراعظم جاپان کے نارو ہیگو ہیگا شیکونی تھے۔ وہ 3 دسمبر 1887ء کو پیدا ہوئے تھے اور 20 جنوری 1990ء کو 102 سال 48 دن کی عمر میں انتقال کر گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ اپنے ملک کے پہلے وزیراعظم بنے لیکن دو ماہ سے بھی کم اقتدار میں رہنے کے بعد اکتوبر 1945ء میں مستعفی ہو گئے تھے۔

مراکش کے وزیر اعظم الحاج محمد المقری 16 ستمبر 1957ء کو اسلامی ہجری سال کے مطابق 116 سال کی زندگی گزارنے کے بعد وفات پا گئے تھے۔ انگریزی سالوں کے مطابق ان کی زندگی 112 سال چھ ماہ پر محیط تھی۔

بھارت کے وزیر اعظم مرار جی رنچھوڑ ڈیسائی 29 فروری 1896ء کو پیدا ہوئے تھے اور مارچ 1977ء میں بھارت کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسطرح 81 سال کی عمر میں وزیراعظم بننے والے پہلے شخص ہیں۔

طویل ترین عرصے تک وزیراعظم رہنے والے

سب سے طویل عرصے تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہنے والے موجودہ وزیر اعظم بحرین کے خلیفہ سلمان الخلیفہ ہیں جو 3 جولائی 1933ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اگست 1971ء میں بحرین آزاد ہوا تھا اور اس وقت سے اب تک وہ وہاں کے وزیراعظم ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ بحرین کی آزادی سے قبل بھی ڈیڑھ سال تک وہاں کے وزیراعظم تھے۔

بہاماس تقریباً سات سو جزائر پر مشتمل بحر اوقیانوس میں واقعہ ایک ملک ہے۔ سر لنڈن پنڈلنگ جنوری 1967ء سے اس ملک کے وزیراعظم ہیں۔ جب کہ بہاماس کو جولائی 1973ء میں برطانیہ سے آزادی ملی تھی۔ مارشل کم ال سنگ 25 اگست 1948ء سے عوامی جمہوریہ کوریا (شمالی) کے سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت ہیں۔

سب سے کم سن سربراہ حکومت

اس وقت سب سے کم عمر سربراہ حکومت بھوٹان کے ... سنگے وانگ چک ہیں۔ وہ 11 نومبر 1953ء کو پیدا ہوئے تھے اور مارچ 1972ء سے وہ اپنے ملک کے سربراہ ہیں جب ان کی عمر صرف 19 سال تھی۔

سب سے بڑی قانون ساز اسمبلی

دنیا کی سب سے بڑی قانون ساز اسمبلی عوامی جمہوریہ چین کی نیشنل پیپلز کانگریس سمجھی جاتی ہے۔ جس کے ایک جماعتی ارکان کی تعداد دو ہزار نو سو اٹھتر ہے۔ یہ ارکان بالواسطہ طور پر پانچ سال کی مدت کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ مارچ 1988ء میں ساتویں کانگریس منتخب ہوئی تھی۔

رپورٹ انٹر کلب ٹورنامنٹ ایوان محمود سپورٹس کلب

الحمد اللہ ایوان محمود سپورٹس کلب ربوہ کا انٹر کلب ٹورنامنٹ ۷ دسمبر تا ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء انعقاد پذیر ہوا۔

ایک لمبے عرصہ کے بعد ایوان محمود کلب کا ہونے والا یہ پہلا ٹورنامنٹ تھا۔ اس میں کھلاڑیوں نے ذوق وشوق سے حصہ لیا۔

یہ ٹورنامنٹ صرف سپورٹس کلب کے ممبران کے درمیان تھا اور اس میں بیڈ منٹن اور ٹیبل ٹینس کے مقابلے ہوئے ہر کھیل میں سنگل اور ڈبل گیمیں ہوئیں۔

بیڈ منٹن میں چالیس کھلاڑیوں نے حصہ لیا جنہیں کھیل کے معیار کی بنیاد پر تین حصوں یعنی سنیئرز' جونیئرز اور جونیئر بوائز میں تقسیم کیا گیا تھا۔

سنگل میں ۳۵ کھلاڑیوں اور ڈبلز میں ۳۶ کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ بیڈ منٹن میں سنگلز کے ۱۰۰ مقابلے ہوئے اور ڈبل کے ۳۷ میچز کھلائے گئے۔

ٹیبل ٹینس میں ۱۳ کھلاڑی شامل ہوئے۔ اس میں ایک ہی معیار تھا۔ سنگل میں ۱۳ کھلاڑی اور ڈبل میں ۱۰ کھلاڑی شامل ہوئے۔ ٹیبل ٹینس میں ۳۹ میچ سنگل اور ۱۱ میچ ڈبل کے کروائے گئے۔

۹ دسمبر ۱۹۹۴ء کو مہمان خصوصی مکرم محترم مرزا غلام قادر صاحب مہتمم مقامی نے جیتنے والے کھلاڑیوں میں انعامات تقسیم کئے۔

ڈاکٹر سلطان احمد مبشر

(صدر ایوان محمود سپورٹس کلب ربوہ)

Monthly Rabwah

REGD. NO. L5830 | Editor. Sayyed Mubashir Ahmad Ayaz | MARCH 1995